دینی، دعوتی، علمی، ادبی، تحقیقی، فکری اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ

نقوش اسلام

VOL.No.9 | فروری ۲۰۱۵ء (February 2015) ربیع الثانی / جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ | Issue.No.12

مجلس سرپرستان

مرشدالامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
ولی مرتاض حضرت مولانا سید مکرم حسین سنسارپوری
عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عبدالقیوم رائے پوری
پیر طریقت حضرت مولانا محمد طلحہ کاندھلوی

مجلس مشاورت

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی
مولانا حسن مرچی مولانا محمد عامر صدیقی ندوی
مولانا محمد احمد صالح جی الحاج موسیٰ اسماعیل درسوت
مولانا حافظ محمد ایوب مولانا محمد زکریا پٹیل
مولانا یحییٰ بام، مولانا رشید احمد ندوی، مولانا محمد منذر ندوی

مجلس ادارت

❁ مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی ❁ مولانا محمد عمر قاسمی مجاہد پوری ❁ مولانا حمید اللہ قاسمی کبیر نگری

چیف ایڈیٹر: محمد مسعود عزیزی ندوی

مدیر انتظامی: حافظ عبدالستار عزیزی

مدیر معاون: ڈاکٹر مرغوب عالم عزیزی

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

NUQOOSH-E- ISLAM
MUZAFFARABAD.SAHARANPUR.247129
(U.P)INDIA. Cell.09719831058
E.mail : nuqooshe_islam@yahoo.co.in
masood_azizinadwi@yahoo.co.in
www. nuqoosheislam.com , www. mifiin.org
ماہنامہ ''نقوش اسلام'' مظفرآباد، سہارنپور 247129 یوپی (انڈیا)

شرح خریداری

ہندوستان کے لیے
فی شمارہ.....۱۵/روپے
سالانہ.....۱۸۰/روپے
خصوصی.....۵۰۰۰/روپے
ایشیائی، یورپی افریقی وامریکی ممالک کے لیے ۵۰/ڈالر

رسالہ کے جملہ امور سے متعلق اس نمبر پر رابطہ کریں: **09719639955**

منیجر توسیع واشاعت: قاری محمد صالحین
09675335910/09813806392

Markazu Ihyail Fikril Islami , A/C No. 30416183580,S.B.I
Monthly Nuqoosh-e-Islam, A/C No. 30557882360,S.B.I

PRINTED, PUBLISHED AND OWNED: MD FURQAN
PRINTED AT LUXMI PRINTING PRESS SAHARANPUR
EDITOR: MD FURQAN

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس شمارے میں

عناوین	مضمون نگار	صفحہ
اداریہ		۳
ارباب مدارس کا تزکیہ	محمد مسعود عزیزی ندوی	
ملفوظات		۵
حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ	مولانا ڈاکٹر محمد حسین للہی	
جواھر القرآن		۸
سورۂ الفیل کی روشنی میں تاریخی معلومات	مولانا محمود الرشید، لاہور	
فکر اسلامی		۱۱
تعلیم وتربیت کے عناصر اور.....تقاضے	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی	
مسائل میراث		۱۹
پوتوں کی وراثت اور ہماری لاپرواہی	مولانا مفتی عبیداللہ اسعدی	
لائحہ عمل		۲۳
موجودہ ماحول میں مسلمانوں کیلئے لائحہ عمل	مولانا فضل حق عارف خیرآبادی	
غوروفکر		۲۶
آخر انہیں شرم کیوں نہیں آتی	حمید اللہ قاسمی کبیر نگری	
فکروعمل		۲۸
قرآن کریم-انقلاب.....کا نقیب	مولانا مفتی محمد اللہ خلیلی قاسمی	
اسوۂ حسنہ		۳۶
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بہترین اسوہ ہے	محمد مسعود عزیزی ندوی	
محبت رسول		۳۹
تحفظ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا مفتی محمد احسان رشیدی	
مرثیہ		۴۲
بیاد مولانا نیاز احمد ندویؒ	مجیب بستوی	
تجزیہ		۴۳
محبت فاتح عالم	مولانا مفتی رحمت اللہ نیپالی ندوی	
کردار وعمل		۴۵
اصلاح معاشرہ میں خواتین کا کردار	مولانا محمد عمر قاسمی مجاہد پوری	
تبصرے		۴۸
نئی کتابوں پر تبصرہ	محمد مسعود عزیزی ندوی	

ماہنامہ ''نقوش اسلام'' کے لئے شرح اشتہار

ٹائٹل صفحہ آخر رنگین (فل سائز).....۳۰۰۰

// // اول اندرونی // // ۲۵۰۰

// // آخر اندرونی // // ۲۰۰۰

صفحہ اندرونی (فل سائز) ۱۰۰۰

آدھا صفحہ اندرونی ۶۰۰

$\frac{1}{4}$ صفحہ // ۴۰۰

اس دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ اسی رسالہ کے ساتھ آپ کی سالانہ مدت خریداری پوری ہورہی ہے، لہٰذا آئندہ کے لیے جلد ہی زرتعاون مبلغ ۱۸۰/روپئے ارسال فرمائیں، تاکہ رسالہ کو جاری رکھا جاسکے۔ (ادارہ)

نوٹ: شائع شدہ مضامین سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں، ہر قسم کی چارہ جوئی کا حق صرف عدالت سہارنپور کو ہی ہوگا۔

پرنٹر پبلیشر: محمد فرقان نے لکشمی آفسیٹ پریس سہارنپور میں طبع کراکے دفتر ماہنامہ نقوش اسلام مظفرآباد سے شائع کیا

کمپوزنگ: عزیزی کمپیوٹر سینٹر: مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفرآباد، سہارنپور، یوپی (الھند)

اداریہ

ارباب مدارس کا تزکیہ

محمد مسعود عزیزی ندوی

مدارس کے کردار، مدارس کی اہمیت وافادیت سے کوئی بھی ہوش مند مسلمان انکار نہیں کرسکتا، مگر جب لوگوں کے ذہن میں کسی چیز کی پیداوار کی کثرت محسوس ہونے لگتی ہے، پھر اس کی افادیت کا احساس کم ہوجاتا ہے، یہی حال کچھ آج کل مدارس کے سلسلہ میں دیکھنے میں آرہا ہے، چونکہ مدارس کا مادی انحصار عوام، تجار اور مخیّرین حضرات کے چندہ پر ہے، اس لئے ارباب مدارس اہل خیر حضرات کے پاس جاتے ہیں، اور ان سے مدارس کے سلسلہ میں چندہ حاصل کرتے ہیں اور سب مسلمانوں کا چندہ دینے کا مزاج نہیں یا سب اس قابل نہیں کہ وہ چندہ دیں، اس لئے جو لوگ چندہ دیتے ہیں، انہیں کے پاس ارباب مدارس کی لائن لگی رہتی ہے، وہیں کثرت محسوس ہوتی ہے، اور وہ تجار یا مخیّرین حضرات محسوس کرتے ہیں کہ مدارس کی کثرت ہے، اسی لئے سوال کرتے ہیں کہ کتنے مدارس ہیں؟ حالانکہ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کے ۴؍فیصد بچے ہی مدرسوں میں تعلیم حاصل کررہے ہیں، ظاہر ہے کہ ۴؍فیصد بچوں کے لئے کتنے مدارس ہوں گے، اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ بات ہر انسان کی طبیعت میں ہے کہ جہاں اس کو اپنا مقصد حاصل ہوتے ہوئے نظر آتا ہے، یا اس کی مطلب برآری ہوتی ہے تو وہ وہاں جاتا ہے اور یہ بات گویا اس کی فطرت میں شامل ہے، اس لئے ارباب مدارس کو جہاں معلوم ہوجائے کہ وہاں سے چندہ مل سکتا ہے، یا ملتا ہے، تو وہ جب بھی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو وہاں کے چکر کاٹتے ہیں، اب یہ مخیّرین اور تجار کے کردار کی آزمائش کا وقت ہوتا ہے کہ وہ ارباب مدارس یا محصلین مدارس کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرتے ہیں اور کس طریقے سے ان کے ساتھ پیش آتے ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اچھے تاجر اچھے مخیّرین ضرور مدد کرتے ہیں، مگر وہ بھی بشر ہیں، بعض مرتبہ وہ ایسے انداز سے پیش آجاتے ہیں کہ بخدا دل ٹوٹ کے رہ جاتا ہے اور نفس کا اچھا خاصا تزکیہ ہوجاتا ہے، اس سلسلہ میں تمام ہی اہل مدارس کو اپنے اپنے حساب سے اپنے دل اور نفس کے تزکیہ کا موقع ملا ہوگا، وہ گھڑی بڑی آزمائش کی بھی ہوتی ہے اور بڑی صبر آزما بھی، اس لئے اس وقت سنبھلنا بہت اہم ہوتا ہے۔

راقم سطور کو بھی اس طرح کے واقعات سے واسطہ پڑا ہے، ایک بہت اچھے مخیّر اور تاجر جن سے تعلق بھی خوب اور وہ تعاون بھی خوب کرتے ہیں، کبھی ایسا بھی ہوا کہ ان کو فون کیا، تو وہ غصے میں آپے سے باہر ہوگئے، بلکہ پاگل کی طرح گفتگو کرنے لگے اور کہنے لگے کہ پیسے کے لئے مجھے فون نہ کرنا، اسی طرح ایک صاحب بہت تعاون کرتے ہیں تشریف لائے، جب ان کو اسٹیشن چھوڑنے کیلئے جانے لگے، راستہ کی خرابی کی وجہ سے دیر ہونے کا امکان تھا، تو وہ ایسی واہی تباہی بکنے لگے اور بدتمیزی پر آگئے کہ دل ٹوٹ کے رہ گیا۔

ایک بڑے تاجر اور مخیّر جنہوں نے بڑا تعاون کیا، اور آئندہ بھی تعاون کا وعدہ کیا اور بہت اچھے اخلاق سے پیش آئے پھر انہوں نے کہا کہ ہمارا کوئی نمائندہ مدرسہ دیکھنے کیلئے آئے گا، وہ کسی بھی وقت آسکتا ہے، ایک مرتبہ ان کو فون کیا، تو انہوں نے کہا کہ میں خود آؤں گا، کچھ دنوں کے بعد جب ان کو فون کر کے یاد دلایا گیا، تو وہ ناراض ہوگئے کہ آپ مجھے فون کر کے ڈسٹرب نہ کرنا اور مجھے فون نہ کرنا، عجیب لگا، یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے اور یہ محسوس ہوا کہ بس کریم آقا ہی ایسا ہے کہ جب بھی پکارو وہ سنتا ہے، باقی اہل دنیا میں تو کوئی کتنا بھی با اخلاق ہو، اکتا ہی جاتا ہے۔

رمضان میں ایک ایسی جگہ جانا پڑا جہاں ٹھہرنے اور کھانے کا کوئی انتظام نہیں، ایک صاحب نے کہہ دیا کہ مسجد میں جماعت آئی ہوئی ہے، ان کے ساتھ لیٹ جانا اور سحری بھی انہیں کے ساتھ کھالینا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، جب سب لیٹ گئے، چپکے سے جا کر مسجد کے اوپری حصہ میں لیٹ گئے، اور سحری میں اٹھ کر جماعت کے ساتھیوں کے ساتھ شریک ہوگئے، تبھی آخر میں دو مقامی آدمی آگئے، دستر خوان پر انہوں نے ہمیں دیکھا، تو پہلے تو ان کو بار سا محسوس ہوتا رہا، اور وہ کچھ بھی ہماری طرف بڑھانے کے لئے راضی نہ ہوئے، کچھ دیر کے بعد اللہ نے ان کو سمجھ دی، کچھ کھانا انہوں نے ہمارے سامنے بڑھایا، اور ہم نے بہت شرم اور عار کے ساتھ کھایا، پھر ان جماعت والوں کو مقامی لوگوں نے ہدایت کردی کہ مسجد کے اوپر کے حصہ میں آتے جاتے وقت تالا لگا دیا کرو، تاکہ کوئی دوسرا بغیر جماعتی یہاں نہ ٹھہر سکے، انہیں ایام میں ہمارے ایک عالم ساتھی نے مسجد کے غسل خانہ میں غسل کرلیا، تو وہاں جماعت والوں کو تالا لگانے کی ہدایت کردی گئی، وہ جماعت والے پاکستان کے تھے، ان کو مقامی لوگوں کے اس عمل سے وحشت ہوئی، اور وہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ہم سب ساتھی جماعت والے رکشہ چلانے والے ہیں، اور ہماری اس قدر پزیرائی ہورہی ہے، اور آپ لوگ عالم و مفتی ہو اور آپ کے ساتھ یہ معاملہ ہورہا ہے، چنانچہ ہم لوگ فاقہ کشی کے عالم میں ہی رہے، نہ رہنے کا ٹھکانہ نہ کھانے کا نظم، دل پر عجیب عجیب باتیں وارد ہوئیں، اور یہ خیال ہوا کہ اے اللہ! یہ ذلت و نکبت تیرے دین کے علمبرداروں کیلئے، اور یہ دعائیں کیں کہ یا اللہ کوئی ایسا انتظام کردے کہ یہ دھکے نہ کھانے پڑیں۔

اس طرح کے حالات سے دلبرداشتہ ہو کے راقم نے اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کو یہ حالات لکھے، تو حضرت والا نے ایک تو یہ نصیحت فرمائی کہ دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں، دل توڑنے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ یہ کام آپ اپنے لئے نہیں کررہے ہیں، بلکہ اللہ کے لئے اور اللہ کے دین کے لئے کررہے ہیں، اس لئے صبر و تحمل سے کام لیجئے، اور مدرسے کے لئے کوئی عمارت وغیرہ بنا کر آمدنی کا ذریعہ بنائیے، جس سے مدرسہ کے اخراجات پورے ہوسکیں۔

ان تمام حالات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اہل مدارس اور محصلین حضرات کے نفس کا اور دل کا تزکیہ ایسا ہوجاتا ہے کہ شاید بہت سے مجاہدوں اور ریاضات سے بھی نہ ہو پاتا، اس لئے راقم کا یہ نظریہ ہے کہ اللہ تعالی ارباب مدارس اور صحیح محصلین کو ایک تو اس لئے کہ وہ اللہ کے نمائندے ہیں، دوسرے اس لئے کہ وہ اہل دنیا کی نظر میں مطعون رہے ہیں اور تجار و مخیّرین نے بھی ان کی خوب لائنیں لگوائی ہیں، اس لئے ان کو بغیر حساب و کتاب کے پہلے مرحلے میں ہی جنت میں پہنچادے گا، انشاء اللہ، کہ یہ لوگ زندگی بھر اہل دنیا کی سن کر، مطعون ہو کر اور ان کے دھکے مکے کھا کر آئے ہیں، اللہ تعالی ہمارے اس گمان کو سچ کردے، اور بغیر حساب و کتاب کے جنت میں پہنچا کر کرم کا معاملہ کردے کہ اللہ کریم ہے۔

ملفوظات

ملفوظات

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ

مولانا ڈاکٹر محمد حسین للہی

هر آدمی میں تین خواهشات پائی جاتی هیں:

ایک دفعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر ایک کتاب جو کسی دیوبندی عالم کی لکھی ہوئی تھی، حضرت کی خدمت میں پڑھ کر سنائی گئی، پڑھنے والے نے کہا ایسی عمدہ باتیں ہمارے حضرات نے لکھی ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بیان کی ہے، لیکن بریلوی مولوی ایسا ایسا کہتے ہیں؟

حضرت نے فرمایا یہ لوگ تو حسد میں مارے گئے، دراصل علماء دیوبند کی مقبولیت انہیں پسند نہیں آئی، حضرت نے پھر فرمایا کہ ہر شخص تین باتیں چاہتا ہے، خواہ وہ کسی ملک کا ہو، کسی قوم کا ہو، کسی مذہب کا ہو اور کسی زمانہ کا ہو، عورت ہو یا مرد، جوان ہو یا بوڑھا، یہ تین خواہشات ہر آدمی میں پائی جاتی ہیں: اول یہ کہ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے، کبھی مرے نہیں، دوسرے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ جوان وصحت مند رہے، کبھی بوڑھا اور بیمار نہ ہو، تیسرے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ عزت اور آرام کی زندگی نصیب ہو، لیکن آج تک یہ تینوں خواہشات کسی کی پوری نہیں ہوئیں، بڑے بڑے بادشاہ، پیغمبر، رشی اور ولی دنیا میں آئے، مگر بالآخر انہیں ایک دن اس دنیا سے کوچ کرنا پڑا، اسی طرح کوئی شخص ہمیشہ جوان نہ رہا، بلکہ ہر شخص کو قانون قدرت کے مطابق بچپن کے بعد لڑکپن، پھر شباب اور پھر بڑھاپے کی منزلوں سے گزرنا پڑا، آخر میں مختلف عوارض کا شکار رہ کر اس دنیا سے رخصت ہونا پڑا، اسی طرح اگر کسی کو چار دن کیلئے مالی خوشحالی یا کوئی اونچا عہدہ مل بھی گیا، تو اس کے ساتھ طرح طرح کی بیماریاں یا پریشانیاں لگی رہیں اور آخر موت نے آکر سب کچھ ختم کر دیا، لیکن اس کے باوجود ہر انسان کے اندر یہ تینوں خواہشات موجود رہیں، یہ خواہشات اللہ تعالی نے انسان میں پیدا فرمائی ہیں اور اللہ تبارک وتعالی حکیم ہیں، ان کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، اللہ تعالی نے انسان کے اندر یہ جو خواہشات پیدا کی ہیں تو ضرور کوئی ایسی جگہ پیدا فرمائی ہے جہاں یہ خواہشات پوری ہوسکیں، سو اس دنیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ یہ خواہشات پوری ہو ہی نہیں سکتیں، اس دنیا کا نظام ہی ایسا ہے کہ یہاں کسی شئ کو بقا اور دوام نہیں ہے، لامحالہ وہ جگہ جنت ہے، جہاں یہ تینوں خواہشات پوری ہوسکتی ہیں، سو ان خواہشات کے حصول کیلئے انسان کو شریعت کا پابند بنایا گیا اور انبیاء کرام بھیجے گئے جنھوں نے انسانوں کو بتایا کہ زندگی گزارنے کا یہ سیدھا راستہ ہے، اگر اس پر چلو گے تو ایک بار موت کے پل سے گزر کر ان تینوں خواہشات کو پورا کر سکو گے، جیسا کہ قرآن مجید اور احادیث میں آیا ہے کہ جنت کی زندگی میں موت نہ ہوگی، نہ بڑھاپا اور نہ کوئی بیماری یا پریشانی ہوگی، ہر طرح کی عزت اور راحت نصیب ہوگی، سو اس زندگی کے پانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ انبیاء کرام بالخصوص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے پر چلا جائے، دیوبندی علماء اسی کی تاکید کرتے ہیں اور اسی پر عمل کرنے کی ہدایت کرتے ہیں جس سے بریلویوں کو جلن اور حسد ہوتی ہے۔

نسب پر فخر نهیں کرنا چاهئے اصل چیزتو عمل هے:

حضرت نے فرمایا کہ ہندو پاک کے بعض لوگ اپنے نسب نامے عربوں سے جوڑتے ہیں اور کوشش کر کے جعلی نسب نامے بنواتے ہیں، کوئی سید بنتا ہے، کوئی قریشی بنتا ہے اور کوئی انصاری بنتا ہے، اس سے کیا حاصل؟ اصل چیز تو عمل ہے اور اس سے تو الٹا اسلام کی توہین ہوتی

ہے، اگر یوں کہا جائے کہ ہم لوگوں کے بڑے کافر تھے، ان کو صحابہ رضی اللہ عنہ نے اسلام سکھایا اور اس طرح ہم کو اپنا بنالیا، تو اس میں اسلام کی بھی عزت ہے اور صحابہ کی بھی، البتہ جو لوگ عربوں کی نسل سے واقعتاً ہیں، وہ اگر اس کا اظہار کریں تو کوئی حرج نہیں؛ لیکن نسب پر فخر نہیں کرنا چاہئے، اصل چیز تو عمل ہے۔

بادشاہوں کا نام صرف کتابوں تک محدود ہے:

حضرت نے فرمایا کہ جب میں دہلی میں پڑھا کرتا تھا تو ایک دفعہ سابقہ بادشاہوں کے مقبرے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور حضرت خواجہ قطب الدین صاحب، خواجہ نظام الدین اولیا صاحب، خواجہ باقی باللہ صاحب اور دوسرے بزرگوں کے مزارات پر حاضر ہوا۔

بادشاہوں اور امراء کے مقبرے اکثر ویران تھے، ان میں گیدڑ اور کتے پھرتے رہتے تھے، لیکن بزرگوں کے مزارات پر ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا، کوئی فاتحہ پڑھ رہا ہے، کوئی قرآن مجید پڑھ رہا ہے، اگرچہ بدعات بھی ہوتی تھیں، میں اکثر سوچتا کہ ایسا کیوں؟ پھر دل میں آیا کہ اولیاء اللہ کی محبت وتعظیم جو لوگوں کے دلوں میں ہے، یہ سب اللہ تعالی کے نام کی برکت سے ہے کہ اب تک لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت اور عزت ہے اور بادشاہوں کو کوئی نہیں جانتا، ان کا صرف تاریخ کی کتابوں میں نام رہ گیا ہے، اس سے ہم نے یہ سمجھا کہ اللہ تعالی کا ہو کر رہنا چاہئے کہ اصل دولت یہی ہے۔

اصل چیز محبت اور شیخ سے مناسبت ہے:

حضرت نے فرمایا توجہ رابطۂ شیخ کا نام ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، اصل چیز محبت اور شیخ سے مناسبت ہے، فرمایا اگر کوئی شیخ اپنے مرید کو کچھ دینا بھی چاہے تاہم مرید کی استعداد نہ ہو یا اللہ تعالی کو منظور نہ ہو، تو کچھ نہیں مل سکتا، ماں جو اولاد پر بہت ہی شفیق ہوتی ہے، اگر بچہ کو اپنی چھاتی سے لگالے اور اپنا پستان بھی اس کے منہ میں دیدے، لیکن اگر بچہ ہی دودھ چوسنے کے لیے ہونٹ نہ ہلائے تو اس میں ماں کا کیا قصور ہے، جب تک بچہ ہونٹ نہ ہلائے گا، ماں سے کچھ حاصل نہ کر سکے گا۔

شیخ کامل کا انتخاب کرنا چاہئے:

حضرت نے فرمایا: اخلاق رذیلہ دور کرنا اور اخلاق فاضلہ حاصل کرنا بغیر صحبت کے نہیں ہوسکتا، لوگ پوچھتے ہیں، تصور شیخ کیا ہوتا ہے میں کہتا ہوں، محبت شیخ کو تصور شیخ کہتے ہیں، اگر تصور شیخ ہی میں رہ گیا تو بس رہ ہی گیا، مقصد اصلی رضائے مولا کا حصول ہے، مگر شیخ کامل کا انتخاب کرنا چاہئے، جو سنت سے سرمو تفاوت نہ کرتا ہو، پھر اس کی محبت میں جتنا زیادہ فنا ہوگا اتنا زیادہ فائدہ ہوگا اور اس کا راستہ جلدی طے ہوگا، شیخ کی صحبت، محبت اور اخلاص سے اختیار کرے، اس سے جلدی آگے نکل جائے گا، مولانا عبدالحئی اپنے شیخ حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ کی محبت میں ایسے فناء تھے کہ جب جان نکل رہی تھی تو فرمایا حضرت آپ میرے سینہ پر اپنا پاؤں مبارک رکھ دیں، بس میری یہ آرزو ہے کہ میری جان اس حال میں نکلے، چنانچہ حضرت سید صاحب نے آپ کے سینہ پر اپنا دست مبارک رکھ دیا اور ایسے ہی مولانا شاہ اسماعیل شہید کو اپنے شیخ سے محبت تھی کہ آخر دم تک سید صاحب کے ساتھ رہے یہاں تک کہ شہید ہوگئے۔

میری قسمت میں جو نہیں ہے وہ مجھے مل جائے:

حضرت نے فرمایا: ایک بزرگ کے بارے میں سنا ہے کہ کسی پہاڑ کی غار میں ذکر کیا کرتے تھے، ایک دفعہ ایک شخص بزرگانہ وضع قطع کے ان کے پاس آئے اور کہا ''السلام علیکم'' میں آپ سے ملنے آیا ہوں، کوئی خدمت ہو تو فرمائیں، ذاکر نے کہا، میرا وقت ضائع نہ کرو، مجھے اپنا وظیفہ پورا کرنے دو، اس نے کہا میں خضر ہوں، لوگ میری ملاقات کی تمنا کرتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں، میں آپ کو خود ملنے آیا ہوں، فرمایا بہت اچھا مگر مجھے اپنا وظیفہ پڑھنا ہے، آپ اپنا کام کریں، مجھے اپنے کام سے غرض ہے، کہا آپ کے لیے کون سی دعا کروں؟ ذاکر نے کہا کہ اگر دعا کرنی ہی ہے تو یہ دعا کرو کہ میری قسمت میں جو نہیں ہے، وہ مجھے مل جائے، فرمایا کہ ملے گی تو قسمت ہی، انہوں نے کہا کہ

جب قسمت خود ہی آ جائے گی، پھر میرا پڑھنا کیوں برباد کرتے ہو، اس کے بعد حضرت نے یہ شعر پڑھا: ؎

پڑھ پڑھ ہوئے پتھر، لکھ لکھ ہوئے چور
جس پڑھنے سے مولا ملے وہ پڑھنا کچھ اور

محبت کے تین اسباب:

حضرت نے فرمایا کہ محبت کے تین اسباب ہوتے ہیں: جمال، کمال اور احسان، جمال کے قصے تو زبان زد عوام وخواص ہیں، یوسف علیہ السلام زلیخا کا قصہ، یہ تو جمال کی مثال ہوئی، اگر کسی میں کمال ہوتا ہے تو اس کی عظمت خواہ مخواہ لوگوں کے قلوب میں پیدا ہو جاتی ہے، اور اس سے لوگ محبت کرنے لگتے ہیں اور جب کوئی شخص کسی پر کچھ احسان کرتا ہے تو اس کی محبت بھی دل میں پیدا ہو جاتی ہے، مثل مشہور ہے "اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانُ" فرمایا یہی تینوں باتیں حق تعالی میں بدرجہ اولی ہیں، انسان کا جمال ہو یا کمال یا احسان، یہ محدود اور فانی ہیں، حق تعالی کا کمال غیر محدود اور غیر محدود فانی ہے تو جو شخص حق تعالی کی ان صفات کو جان لیتا ہے، اس کے دل میں اللہ کی محبت آتی ہے اور وہ کبھی غافل نہیں ہو سکتا۔

اپنے شیخ ھی سے سب کچھ پوچھنا چاھئے:

حضرت نے فرمایا جب کوئی آدمی کسی سے بیعت ہو تو اسی سے سب کچھ پوچھنا چاہئے، یہ نہیں کہ کبھی کہیں چلا گیا، کبھی کہیں، اس سے کیا فائدہ، پھر فرمایا کہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ اپنے پیر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خدمت میں رہتے تھے، ایک دفعہ ان کے پیر (حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری) ان کے پاس تشریف لے گئے، تو بابا فرید صاحب کو خواجہ قطب الدین صاحب نے فرمایا کہ حضرت کو دباؤ، بابا فرید ان کو دبانے لگے، تھوڑی دیر کے بعد ان کو چھوڑ کر اپنے پیر سے چمٹ گئے اور عرض کیا، حضرت ایک ہی دل تھا وہ تو آپ کو دے دیا، اب دوسرا کہاں سے لاؤں، حضرت خواجہ قطب الدین صاحب کو یہ بات پسند نہ آئی، لیکن حضرت خواجہ معین الدین صاحب نے فرمایا، شاباش! اپنے پیر کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہونا چاہئے اور بہت خوش ہوئے، فرمایا: یہ عملیات اور کرامات تو محض تماشے ہیں، فقیری کچھ اور ہی ہے۔

اللہ تعالی کے نام میں برکت ھے:

حضرت نے فرمایا کہ جتنے بھی بڑے بڑے بزرگ ہوئے ہیں، مثلاً حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہم ان حضرات نے عملیات کی طرف توجہ نہیں دی، سب نے اللہ کا نام ہی لیا ہے، اور اللہ تعالی سے تعلق پیدا کیا، پھر فرمایا کہ ہم نماز میں "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ" پڑھتے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی ہی کے نام میں برکت ہے، اسی سے سب کچھ ہوتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم کی دعاء کا انداز:

حضرت نے فرمایا ہم اپنے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری کے پاس عرصہ تک رہنے کی وجہ سے حضرت کی عادات سے واقف ہو گئے تھے اور یہ کوئی کمال کی بات نہیں، کتا بھی جب اپنے مالک کے پاس رہتا ہے تو اپنے مالک کی عادات سے واقف ہو جاتا ہے، حضرت کی خدمت میں جب کوئی شخص دعا کے لیے عرض کرتا تو کبھی یوں فرماتے، ہاں انشاء اللہ ضرور دعا کریں گے اور کام ہو جائے گا اور کبھی یوں فرماتے ہاں دعا کریں گے، ہمارا کام تو دعا کرنا ہے منظور کرنا نہ کرنا اس کا کام ہے، اس پر ہم یہ سمجھ جاتے کہ کام نہیں ہوگا اور ایسا ہی ہوتا، جب پہلی قسم کے الفاظ فرماتے تو درخواست کرنے والے کا کام ضرور ہو جاتا اور جب دوسری قسم کے الفاظ فرماتے تو کام نہیں ہوتا، اور ہم بارہا اس کا تجربہ کر چکے تھے، تو یہ بغیر مکالمہ باری تعالی اور اس طرف سے مطلع ہونے کے کیسے ہو سکتا ہے، فرمایا حضرت جب کبھی مجھے کوئی چیز عنایت فرماتے تو میں انکار کر دیتا، ایک دفعہ حضرت نے فرمایا جب میں کوئی چیز دیا کروں تو لے لیا کرو، کیونکہ میں اپنی طرف سے نہیں دیتا، ادھر سے جو حکم ہوتا ہے اسی کے مطابق دیتا ہوں۔ ❁❁

جواہر القرآن

سورۃ الفیل کی روشنی میں تاریخی معلومات

مولانا محمود الرشید حدوٹی استاد جامعہ اشرفیہ لاہور

سورۂ فیل کی وجہ تسمیہ:

"اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ الخ" اس سورت کا نام سورۂ فیل ہے۔

وجہ تسمیہ: اس سورت میں "اصحاب الفیل" کا ذکر ہے جنہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت والے سال اللہ تعالی کے گھر "خانہ کعبہ" کو گرانے کی غرض سے ہاتھیوں کی فوج لیکر مکہ مکرمہ پر چڑھائی کردی تھی، جن کو اللہ تعالی کے حکم سے پرندوں کے ذریعہ ہلاک وبرباد کردیا گیا تھا، عربی زبان میں ہاتھی کو "فیل" کہتے ہیں، اصحاف فیل کا معنی ہے، ہاتھی والے، اس وجہ سے اس صورت کا نام "الفیل" رکھا گیا ہے، چونکہ اس سورت میں ہاتھی والوں کا عبرتناک انجام ذکر کیا گیا ہے۔

واقعہ فیل کب واقع ہوا؟

حضرات مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ واقعہ فیل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت والے سال پیش ہوا، مشہور مفسر قرآن عماد الدین ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "جس سال یہ واقعہ پیش آیا اسی سال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے"۔

معجزہ یا ارھاص:

بعض اہل علم نے اس واقعہ کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دیا ہے لیکن بعض علماء نے اس کو معجزہ کی بجائے "ارہاص" کہا ہے، معجزہ اور ارہاص میں یہ فرق بیان کیا گیا ہے کہ کسی نبی کی آمد سے پہلے اللہ تعالی کچھ خارق عادت واقعات اور نشانیاں دکھلاتے ہیں جو معجزہ کی طرح ہوتی ہیں، ان نشانیوں کو "ارہاص" کہا جاتا ہے، یہ لفظ بنیاد اور تمہید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، کیونکہ عربی زبان میں "رہص" سنگ بنیاد کو کہا جاتا، انبیاء کی آمد سے پہلے اور ان کی طرف سے نبوت کے دعوے سے پہلے چونکہ عجیب وغریب نشانیوں اور واقعات کا ظہور ہوتا ہے، جو ان کی نبوت کے اثبات کا مقدمہ ہوتا ہے، اس لئے اس کو "ارہاص" کا نام دیا گیا ہے اور یہی واقعات اگر دعوائے نبوت کے بعد ظاہر ہوں تو ان کو معجزہ کہا جاتا ہے۔

یمن کے بادشاہ:

واقعہ فیل کے مطالعہ سے پہلے ایک نظر یمن کے بادشاہوں پر کیجئے:

(۱) سبا بن یشجب نامی شخص یمن کا سب سے پہلا بادشاہ تھا، جس نے چار سو چراسی سال حکمرانی کی۔

(۲) حمیر بن سبا جس نے پچاس سال حکمرانی کی، یہ یمن کا وہ بادشاہ تھا جس نے سب سے پہلے سونے کا تاج اپنے پر رکھا تھا۔

(۳) کہلان بن سبا نے تقریباً تیس سال حکومت کی۔

(۴) ابو مالک عمرو بن سبا نے ایک سو بیس سال حکومت کی، یہ بڑا عادل اور نیکوکار حکمران تھا۔

(۵) جبار بن غالب نے بھی ایک سو بیس سال حکومت کی۔

(۶) حارث بن مالک نے ایک سو چالیس سال حکومت کی۔

(۷) رائش بن شداد نے ایک سو پچیس سال حکومت کی۔

(۸) ابرہہ بن رائش نے ایک سو اسی سال حکومت کی۔

(۹) افریقس بن ابرہہ نے ایک سو چونسٹھ سال حکومت کی۔

(۱۰) عبد بن ابرہہ نے پچیس سال حکومت کی۔

(۱۱) ہدھاد بن شرجیل نے دس سال حکومت کی۔

(۱۲) تبع الاول نے چار سو سال حکومت کی اسے بلقیس نے قتل

کر دیا تھا۔

(۱۳) بلقیس بنت ہدھاد نے ایک سو بیس سال حکومت کی۔

(۱۴) حضرت سلیمان علیہ السلام نے تیس سال حکومت کی۔

(۱۵) ناشر بن النعم بن عمرو نے پینتیس سال حکومت کی۔

(۱۶) شمر بن افریقس بن ابرہہ نے ترپن سال حکومت کی۔

(۱۷) تبع الاقرن بن شمر نے ایک سو تریسٹھ سال حکومت کی۔

(۱۸) کلیکر ب بن تبع نے ایک سو بیس سال حکومت کی۔

(۱۹) حسان بن تبع نے پچیس سال حکومت کی، اسے معزول کرنے کے بعد قتل کر دیا گیا تھا۔

(۲۰) عمرو بن تبع نے چونسٹھ سال حکومت کی، اسی نے اپنے بھائی حسان کو قتل کیا تھا۔

(۲۱) تبع بن حسان بن کلیکرب نے سو سال حکومت کی، یمن سے حجاز تک اس کی حکمرانی کا سکہ چلتا تھا اور خزرج کے ساتھ اس نے لڑائیاں لڑیں، اس نے کعبہ کو گرانے کا ارادہ کیا لیکن اس کے ساتھ چونکہ یہودی علماء ہوتے تھے، انہوں نے اسے اس کام سے روکا۔

(۲۲) عمر بن تبع نے چالیس سال حکمرانی۔

(۲۳) ولیعہ بن مرثد نے انتالیس سال کے حکومت کی۔

(۲۴) ابرہہ بن صباح بن ولیعہ بن مرثد نے ترانوے سال حکومت کی۔

(۲۵) عمرو بن ذی قیفان نے سترہ سال حکومت کی۔

(۲۶) ذو شناتر نے انتیس سال حکومت کی اسے ذونواس یوسف نے قتل کر دیا تھا، اس کے اندر اخلاقی برائیاں پیدا ہوگئی تھیں۔

(۲۷) یوسف ذونواس بن زرعہ نے دو سو ساٹھ سال تک حکومت کی، یہ وہی بادشاہ ہے جس نے اپنے دور حکومت میں عیسائیوں پر ظلم کئے، اس نے ایک لمبی چوڑی خندق کھود کر اس کو آگ سے بھرا جتنے نصاری بت پرستی سے بچتے تھے اور ایک اللہ کی عبادت کرتے تھے، ان سب کو اس ظالم نے خندق میں ڈال کر جلا دیا، جلنے والوں کی تعداد بیس ہزار تھی، اس واقعہ کا ذکر قرآن کریم کے تیسویں پارے کی سورۂ بروج میں موجود ہے۔

(۲۸) ارياط بن اصحمہ نے بیس سال حکومت کی۔

(۲۹) ابرہہ بن الاشرم ابو یکسوم نے تینتالیس سال حکومت کی۔

(اثمار التکمیل جلد ۲/صفحہ ۱۲۵ تا ۱۲۷)

یمن کے ان انتیس حکمرانوں کی فہرست میں ابرہہ تین ہیں:

(۱) ابرہہ بن رائش

(۲) ابرہہ بن صباح

(۳) ابرہہ بن الاشرم ابو یکسوم

ان میں ابرہہ الاشرم ابو یکسوم نے خانہ کعبہ گرانے کی سازش کی تھی ابرہہ الاشرم اور ارياط بن اصحمہ یوسف ذونواس کے ہاتھ سے اس وقت نکل گئے تھے جب اس نے ایک خدا کی عبادت کرنے والوں کو خندق کھود کر اس میں جلا دیا تھا، انہوں نے قیصر ملک شام سے جا کر فریاد کی تھی کہ ذونواس نے عیسائیوں پر بڑا ظلم کیا تھا، اس سے انتقام لیا جائے، قیصر ملک شام نے حبشہ کے عیسائی بادشاہ کے نام خط بھیجا کہ اس ظالم بادشاہ سے اس ظلم کا بدلہ لو، چنانچہ حبشہ کے عیسائی بادشاہ نے ارياط اور ابرہہ کی قیادت میں ایک لشکر یمن کے ظالم بادشاہ کے مقابلہ کے لئے روانہ کر دیا، لشکر بادشاہ پر ٹوٹ پڑا، پورے یمن کو قوم حمیر سے چھڑا لیا، ظالم بادشاہ بھاگ گیا، بھاگم بھاگ دریا میں غرقاب ہوکر مر گیا اور ارياط اور ابرہہ کے ذریعہ حبشہ کے بادشاہ کا یمن پر قبضہ ہوگیا، پھر ایک وقت آیا جب ان دونوں میں اقتدار کی کشاکش شروع ہوگئی، دونوں کے درمیان جنگ ہوئی، ارياط کو قتل کر دیا گیا، اب جب میدان صاف ہوگیا تو حبشہ کے بادشاہ نے ابرہہ کو یمن کا گورنر بنا دیا، شاہ حبش کی وفات کے بعد اس کے جانشین نے ابرہہ کو یمن میں اپنا نائب السلطنت بنا دیا تھا۔

ابرهه:

ابرہہ کو یونانی مؤرخین نے ابرامس Abrames لکھا جب کہ سریانی

مؤرخین اسے ابراہام Abraham لکھتے ہیں، ابرہہ اس کا حبشی تلفظ ہے، عربی زبان میں اس کا تلفظ ابراہیم ہے، ابرہہ انتہائی زیرک اور سمجھدار آدمی تھا، ارياط اور ابرہہ دونوں نے مل کر ذونواس کا مقابلہ کیا، اس کے اقتدار کا دھڑن تختہ کیا، علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ارياط اور ابرہہ ذونواس کے دریا میں ڈوب مرنے کے بعد یمن میں رہنے لگے، تھوڑی مدت بعد ان کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے، نوبت جنگ تک پہنچ گئی، دونوں نے ایک دوسرے کے مقابل صف بندی کر لی اور لڑنے کے لئے میدان میں نکل آئے، عام حملہ ہونے سے پہلے ان دونوں نے ایک دوسرے کو کہا فوجوں اور لوگوں کو لڑانے کی بجائے ہم دونوں آپس میں لڑیں جو ہم میں زندہ بچ جائے وہ ملک وفوج پر قبضہ کرلے، دونوں اس بات پر رضامند ہوگئے، ارياط نے ابرہہ پر پہلے حملہ کیا، تلوار کے ایک ہی وار سے ابرہہ کو لہولہان کر دیا، اس کے ناک، ہونٹ اور منہ کٹ گئے، ابرہہ کے غلام عتودہ نے جب اپنے مالک کو خون میں لت پت دیکھا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً اس نے ارياط پر ایک زبردست حملہ کیا، جس سے ارياط موت کے منہ میں چلا گیا، ابرہہ سخت زخمی ہوگیا تھا، لیکن میدان سے زندہ واپس آ گیا تھا، علاج ومعالجہ کے بعد اس کے زخم مندمل ہوگئے، ابرہہ یمن کا مستقل بادشاہ بن گیا۔

حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو سخت برہم ہوا، اس نے اسی غصہ میں ابرہہ کو ایک خط لکھا، جس میں اس نے ابرہہ کو بڑی لعن طعن کی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ قسم بخدا میں تیرے شہروں کو پامال کردوں گا، تیری چوٹی کاٹ لاؤں گا، ابرہہ یہ خط پڑھ کر ذرہ بھر مشتعل نہیں ہوا، اس نے اپنے اقتدار کی دوام اور بقا اسی میں سمجھی کہ حکمت عملی اور دانشمندی سے اس کا جواب لکھا جائے، ابرہہ نے نہایت عاجزی، انکساری اور مسکنت کے ساتھ شاہ نجاشی کے غصہ سے لبریز خط کا جواب لکھا، بہت سے ہدیے اور تحفے نیز یمن کی مٹی ایک تھیلی میں ڈال کر اپنی پیشانی کے بال کاٹ کر اس میں رکھ دئے، خط میں ابرہہ نے اپنے قصور کی معافی مانگی اور لکھا کہ یمن کی مٹی حاضر ہے، میری چوٹی کے بال حاضر ہیں، آپ اپنی قسم پوری کیجئے، ناراضگی معاف فرمایئے، اس سے شاہ حبشہ کا غصہ ٹھنڈا ہوا وہ خوش ہوگیا اور یمن کی سرداری کا تاج ابرہہ کے سر پر سج گیا۔

ابرہہ نے رفتہ رفتہ اپنا اثر ورسوخ بڑھانا شروع کر دیا، برائے نام شاہ حبشہ کی بالادستی کو تسلیم کرلیا، ابرہہ نے اپنی کمال ذہانت اور فہم وفراست سے قیصر روم شاہ ایران، شاہ حیرہ اور شاہ غسان کے نمائندوں تک کو اپنے ایک عظیم جشن میں شرکت کی دعوت دے کر متاثر کر ڈالا۔

ابرہہ نے یمن میں پوری طرح قابض ہونے کے بعد اس مشن پر یہاں کام شروع کر دیا، جو رومی حکومت اور حبشی عیسائیوں کے پیش نظر شروع دن سے تھا، ایک طرف یہ لوگ عرب دنیا میں عیسائیت پھیلانے کے پراگندہ خواب دیکھ رہے تھے اور دوسری طرف عربوں کی دور دراز تک پھیلی ہوئی تجارت پر قبضہ کرنا۔ (بشکریہ ماہنامہ ''الصیانۃ'' لاہور مارچ ۲۰۰۰ء)

رحمت خداوندی کا نزول

اللہ کی رحمت کا نزول اسی وقت ہوتا ہے جب کہ ملت کے ہر فرد میں ذمہ داریوں کا احساس، حالات کو سمجھنے اور اس کے مطابق جذبہ وشعور کے ساتھ کام کرنے کی صلاحیت اور دل سوزی وفکر مندی کا مظاہرہ ہو، جو کچھ ہو رہا ہے اور اب واقعات کے طور پر جو کچھ پیش آ رہا ہے، اس کا دھارا اس قدر تیز اور مشینری اس قدر چابک دست ہے کہ صاف نظر آ رہا ہے، کہ اگر اجتماعی طور پر ملت اسلامیہ نے اس پر سنجیدگی اور دردمندی سے غور نہیں کیا تو مستقبل میں اس کا جو خمیازہ بھگتنا ہوگا، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ آنیوالے دنوں میں اس ملت کا اور اسکی نوجوان نسل کا تعلق اسلام اور اس کے بنیادی دینی عقائد سے باقی رہے گا یا نہیں؟۔

اس ملت کے لیے یہ بات مخصوص کی گئی ہے کہ جب تک اپنی طرف سے محض اللہ تعالی کی رضا کی خاطر کام کا مظاہرہ نہیں ہوگا اس وقت تک اللہ کی رحمت نہیں آئے گی اور جب اللہ کی رضا کی خاطر کام کا مظاہرہ ہوگا تو ان کام کرنیوالوں میں ایک غیر مرئی طاقت کا اضافہ کر دیا جائے گا ''یزدکم قوۃ الی قوتکم''۔ (سورۂ ہود آیت ۵۲)

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی)

فکر اسلامی

تعلیم وتربیت کے قدیم وجدید عناصر اور اسلامی تقاضے

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ماضی میں تعلیم وتربیت کے تین عناصر ہوتے تھے: طالب علم، کتاب اور استاد، اسی وجہ سے جب کسی شخصیت کے تشکیلی عناصر پر بحث کی جاتی تو انہی تین عناصر کی روشنی میں بحث کی جاتی کہ اس نے کونسا نصاب پڑھا ہے، مربی اور استاد کیسا ہے؟ اور طالب علم نے خود کس شوق ومحنت سے علم حاصل کیا اور اس کے لئے کیا مشقتیں برداشت کیں اور قربانی دی، اسی لئے حصول علم کے شائقین بڑے اساتذہ اور مشہور اہل فن کا انتخاب کرتے، دور دراز کا سفر کرتے اور اس کے لئے بڑی مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کرتے، بعض شائقین کے علم کے بارے میں آتا ہے کہ تحصیل علم مکمل کر لینے کے بعد معلوم ہوا کہ فلاں علاقہ میں ایک ایسی شخصیت ہے جس سے مزید اکتساب علم کیا جاسکتا ہے، تو وہ دور دراز کا سفر طے کر کے وہاں جا کر مزید علم حاصل کرتے تھے، اس کی ایک مثال تبریزی کی ہے جو علم کی تکمیل کے بعد ایک مدت تک ابوالعلاء المعری سے استفادہ کرتے رہے، چنانچہ فخر اور اہمیت ظاہر کرنے کے لئے کہا جاتا کہ فلاں شخص نے فلاں بڑے عالم سے حدیث شریف کی فلاں فلاں کتابیں پڑھیں، اس لئے استاد کے نام سے طالب علم کی صلاحیت ولیاقت کا اندازہ کیا جاتا تھا، کیونکہ کسی بڑے عالم کی طرف نسبت اور اس سے تحصیل علم کی سند طالب علم کی کامیابی اور علم فن میں اس کی مہارت وپختگی کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔

قدیم نظام تعلیم میں تعلیمی عمل کی کامیابی میں استاد ومعلم کی صلاحیت وعلمی سطح اور طالب علم کے شوق علم اور اس کے حصول کا قصد وارادہ اور ذوق وشوق کا بڑا دخل تھا، ماضی میں چونکہ علم سے مادی فائدہ اور دنیاوی منافع وابستہ نہیں تھے، اور نہ ہی حصول علم سے کوئی عہدہ ومنصب حاصل ہونے کی امید تھی اور نہ روشن مستقبل کی ضمانت، اس لئے جو لوگ تعلیم کی طرف توجہ دیتے، صرف اپنے ذوق وشوق کی بناء پر علم کی طرف توجہ دیتے اور کسی خاص موضوع میں مہارت پیدا کر کے مرجع علم بنتے، بعض وقت ایک استاد سے استفادہ کے بعد دوسرے استاد سے استفادہ کے لئے سفر کرتے، قدیم نظام تعلیم میں طالب علم تعلیم کے مشغلہ سے الگ کسی دوسرے مشغلہ سے اپنے کو دور رکھتا تھا بعض طلبہ گھر کے ماحول سے پوری طرح غیر متعلق رہتے تھے، یہاں تک کہ بعض علم کا شوق رکھنے والے گھر یا وطن سے آنے والے خطوط تک نہیں پڑھتے تھے، نہ وہاں سے آنے والوں سے ملاقات کرتے تھے، تفریحی مشاغل سے درکنار ثقافتی سرگرمیوں سے دور رہتے تھے، کتاب اور استاد کے علاوہ ان کی توجہ کسی اور طرف مبذول نہیں ہوتی تھی۔

تحصیل علم کے دوران اخلاقی اور ذہنی تربیت کا بھی استاد خیال رکھتا تھا، بعض حالتوں میں علم کی تحصیل کے بعد طلبہ اخلاقی اور روحانی تربیت کے لئے ایسے صاحب فضل وکمال کی خدمت میں وقت گزارتے تھے جو روحانی لحاظ سے مرجع تھے، تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔

لیکن آج علم دیگر فنون اور پیشوں کی طرح ایک پیشہ بن گیا ہے، اور دنیاوی، مادی، شخصی اور اجتماعی منافع ومقاصد کے حصول کا فعال وبہترین اور معیار زندگی کو بلند کرنے کی ضمانت، علم ہی کے راستہ سے یورپ نے پوری دنیا پر اجارہ داری قائم کر لی ہے، عقلوں اور ذہنوں کو اپنا غلام بنالیا ہے، اس دور میں علم کی اہمیت، افادیت اور نافعیت کو

دیکھتے ہوئے ہر شخص حصول علم کے لئے کوشاں ہے، جس کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے والوں کا تناسب بڑھ گیا ہے، حتی کہ ملکوں کی ترقی کا اندازہ وہاں خواندگی اور ناخواندگی کے تناسب سے لگایا جاتا ہے، اور علم کے فروغ وترقی کی رفتار سے ملک ترقی کرتے ہیں۔

متمدن دنیا میں تعلیمی اداروں اور علمی مراکز بڑی تعداد میں قیام اور علم کی طرف بڑھتے ہوئے رجحان کو دیکھ کر تعلیم وتربیت سے اشتغال رکھنے والوں نے حصول علم کی کوششوں کی، تنظیم وتنسیق پر توجہ دی اور اپنے اپنے تجربات، موجودہ زندگی کے تقاضوں، ملک کی ضرورت، معاشرہ اور انسان کے تعلق سے اپنے اپنے تصور ونظریہ کے مطابق تعلیم وتربیت کے اصول ومبادی وضع کئے، تعلیم کی ذمہ داری، حصول علم کا مقصد اور اس کا طریقہ کار متعین کیا، تعلیم وتربیت کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ترغیب وتشویق کے مختلف طریقے تلاش کئے، تعلیمی مواقع اور وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے مختلف زاویوں اور پہلوؤں پر غور کرکے نئی نئی راہیں تلاش کیں، ماہرین تعلیم کے تصور زندگی اور فلسفہ حیات کے مطابق طلبہ کی ذہنی اور عقلی تشکیل کے لئے معلمین کی ٹریننگ کا نظام قائم کیا، تاکہ وہ تعلیمی وسائل کا صحیح استعمال کرکے واضعین نصاب تعلیم کی منشاء کے مطابق طلبہ کے ذہن وفکر کی تشکیل کرسکیں، اب اس دور میں تعلیم وتربیت کے عمل میں قدیم موروثی وسائل ہی پر اکتفاء کیا نہیں جاتا ہے، بلکہ ثقافتی وسائل تربیت سے لیکر وسائل ابلاغ سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے اور اب یہ سارے وسائل ذہن کی تشکیل، فکر کی تعمیر وتربیت اور تعلیمی عمل میں استعمال کئے جانے لگے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے نظام تعلیم میں نصاب تعلیم دوسرے نمبر پر آتا ہے اور تعلیم کے بنیادی مقصد اور انسان کے بارے میں موجودہ تصور کے تابع ہوتا ہے اور تعلیم کا یہ تصور ماحول، ملک اور وہاں کے نظام زندگی اور تقاضوں کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے، موجودہ نظام تعلیم میں فلسفہ تعلیم بنیادی محور کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے اردگرد تعلیم وتربیت کا ہر شعبہ گردش کرتا ہے، اسی وجہ سے تعلیمی عمل مندرجہ ذیل عناصر سے مرکب ہے:

(۱) طالب علم

(۲) کتاب یا نصاب تعلیم

(۳) استاد

(۴) استاد کی صلاحیت ولیاقت، اس کا فکری مسلک، طریقہ کار وسلوک، ملک کے تقاضے اور حالات۔

(۵) تعلیمی ماحول، اس میں مندرجہ ذیل باتیں آتی ہیں:

مختلف عناصر سے اختلاط، متنوع موضوعات پر مشتمل کتب خانے، مطالعہ میں وسعت اور گہرائی وگیرائی پیدا کرنے کی ترغیب وتشویق اور ہمت افزائی، نظریات وافکار کا مطالعہ، اسفار، ملاقاتیں، ورکشاب اور کانفرنسیں، ذہن وعقل کو کھولنے اور تازگی کے لئے ورزش، اس کے لئے گھریلو اور خاندانی ماحول سے دور رکھ کر ہوسٹلوں میں قیام کو ترجیح دی جاتی ہے، تاکہ پورے نظام تعلیم وتربیت پر عمل کیا جاسکے۔

(۶) ذرائع ابلاغ جس میں ریڈیو اور ٹی وی بھی داخل ہیں۔

(۷) فلمیں، ڈرامے، واقعات وحکایات، یہ سارے ذرائع افکار وخیالات اور غیروں کے طرز ہائے زندگی کو طالب علم کے ذہن میں بٹھانے کے اہم وسیلے ہیں اور ذہن سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

یہ مغربی نظام تعلیم کی تربیت ہے، جو مغرب ومشرق کے سارے ملکوں میں مغرب کی تقلید میں رائج ہے، جو انسان کے بارے میں مغربی فلسفہ کے مطابق ہے، عالم اسلام کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم کا نظام اس کے فلسفہ حیات اور تصور زندگی کے مطابق ہو، علم اور تہذیب وتمدن کا صحیح مفہوم ومطلب بیان کیا جائے، اور اسلامی تصور زندگی اور فلسفہ حیات کی پابندی کی جائے، چنانچہ جب تصور زندگی اسلامی تصور کے مطابق ہوگا تو تعلیم کے نتائج اچھے مرتب ہوں گے، خواہ تعلیم کی نوعیت کچھ بھی ہو۔

عالم اسلام کے بعض ملکوں میں نصاب تعلیم کی طرف توجہ کی گئی اور اسلامی تصور کے منافی افکار وتصورات اور خیالات ورجحانات سے نصاب تعلیم کو پاک وصاف کرنے کی کوششیں کی گئیں اور اسلامی مضامین نصاب میں شامل کئے گئے اور لوگوں نے یہ خیال کرلیا کہ نصاب تعلیم کی جزوی تبدیلی سے مغربی نظام تعلیم کی خرابیوں سے بچاجاسکتا ہے، بلاشبہ درسی کتابوں کی بڑی اہمیت ہے اور ذہن سازی میں اس کا بڑا رول ہے، لیکن یہ صرف تعلیم کی ایک اکائی ہے، کل نہیں، اس کے ساتھ ساتھ اساتذہ ایک اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں، تعلیمی ماحول، ثقافتی پروگرام اور ذرائع ابلاغ اور تہذیبی قدریں بھی اس نظام کا اہم جزء ہیں۔

مثال کے طور پر کسی یورپی ملک میں اسلامی نصاب پڑھایا جائے اور ماحول پورا مغربی یا غیر اسلامی ہوتو اس کے کیا نتائج نکلیں گے، مستشرقین کی بڑی تعداد اس کی دلیل ہے، اس طرح اگر عالم اسلام تمدنی اور فکری میدان میں مغرب کی کورانہ تقلید کرتا رہا، یورپین ممالک کے تہذیبی رجحان کی نقالی کرتا رہا، مغربی تعلیم یافتہ حضرات کی زندگی کے متعلق پیش کردہ تصورات ورجحانات اور سعادت وشقاوت کے متعلق ان کے متعین کردہ معیار پر کاربند رہا اور مغرب کے نظام تعلیم وتربیت پر اعتماد کرتا رہا تو صرف نصاب کی تبدیلی سے کوئی بڑا انقلاب نہیں آسکتا۔

نصاب تعلیم کے مسئلہ پر غور وخوض ہوتا رہا ہے، بڑے بڑے مفکرین اور دانشوروں نے اس کے حل کی کوششیں کیں اور حل پیش کئے اور اس میں تبدیلی اور تنقیح کے مختلف طریقے تجویز کئے اور اس سلسلہ میں بڑی قیمتی اور اہم کوششیں ہوئیں، جن کے کسی حد تک نتائج بھی برآمد ہوئے، یقیناً یہ کاوشیں بڑی قابل قدر ہیں اور زندگی کے صحیح رخ کے تعین میں ان کا بڑا حصہ ہے لیکن اس کے علاوہ تعلیم وتربیت کے میدان میں کچھ اور قابل توجہ پہلو ہیں جن کا ذہن کی تشکیل اور شخصیت کی تعمیر میں بڑا اہم رول ہے، یہ تعلیم کا فلسفہ اور اس کا وہ مقصد ہے جو تعلیم اور مقصد علم کے متعلق اسلام کے تصور کے منافی ہے اور تعلیم وتربیت کے وسائل ان کتابی وسائل کے علاوہ ہیں، جو موجودہ زمانہ میں عام ہوچکے ہیں۔

یورپی تصور میں علم اور تہذیب کا مقصد مادی منافع اور انسان کے دنیاوی اغراض کے تابع ہے، یورپ کے ماہرین تعلیم کا مطالبہ ہے کہ طالب علم کو اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور فروغ دینے کے لئے ہر طرح کی آزادی دی جائے اور اس کے مادی مقاصد کے حصول کے لئے مواقع فراہم کئے جائیں، اور وہ حصول علم کو اس کا وسیلہ قرار دیتے ہیں، جب کہ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ علم معرفت الٰہی کا نام ہے، وہ علم کو نافع اور غیر نافع میں تقسیم کرتا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم غیر نافع سے پناہ مانگی ہے: اللّٰھم انی اعوذبك من علم لاینفع ، ومن قلب لایخشع ومن دعاء لایستجاب له" علم کے ساتھ صحیح فکر کے ذریعہ انسان آفاق وانفس میں مظاہر قدرت کو پہچانتا ہے، زندگی کے اصول ومبادی اور نوامیس کو جانتا ہے اور ہر چیز کے حدود کے جاننے، انسان کے تعامل کی خصوصیات کو پہچاننے، اچھے برے کے درمیان تمیز کی صلاحیت کا نام علم نافع ہے، اس کے علاوہ اسلام کی نظر میں علم کا تعلق صرف فرد واحد سے نہیں، بلکہ سماج کے تمام افراد سے ہے، اس کا انحصار صرف دنیاوی امور پر ہی نہیں بلکہ اس کا تعلق اخروی امور سے بھی ہے، قرآن کریم علم کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے: " اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓاءُ" حدیث شریف میں وارد ہے کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں "اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ" انبیاء کا بنیادی کام تعلیم کے ساتھ تزکیہ اور دعوت الی الخیر ہے، سماج کی اصلاح ہے، اس سے اسلام نے علم کو دعوت سے مربوط کیا ہے، اسلامی نقطہ نظر سے علماء تعلیم وتربیت، تزکیہ نفس، احسان، دعوت وارشاد، اصلاح معاشرہ، عدل وانصاف کے قیام اور بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی کی طرف لانے میں انبیاء کرام کا کردار ادا کرتے ہیں، چنانچہ اسلام میں عالم کو جو مقام ومرتبہ حاصل ہے اس کی کوئی عہدہ ومنصب ہمسری نہیں

کرسکتا اور کبھی کبھی علماء کی روشنائی شہداء کے خون سے ممتاز ہوجاتی ہے۔

آج عالم اسلام میں مغربی تصور زندگی پر مبنی جو نظام تعلیم رائج ہے اس نے علم کو تنگ مادی دائرہ میں محصور کردیا ہے، چنانچہ آج علم کا مقصد یہ ہے کہ ایسے مواقع فراہم کئے جائیں جن کے ذریعہ انسان اپنی عملی وعقلی صلاحیتوں کو استعمال کرکے ایسے وسائل حاصل کرلے جو کم سے کم اس کے معیار زندگی کو بلند کریں وہ اپنے معاشرہ اور ماحول کے معیار کو بلند کرسکے یا نہ کرسکے، مغربی نظریہ تعلیم صرف انسانی تجربات اور معلومات وحقائق بہم پہنچانا ہے تاکہ یہ صلاحیتیں پروان چڑھائی جاسکیں اور طالب علم کو وسائل کا استعمال سکھایا جاسکے۔

مغربی تصور کے مطابق مثالی انسان وہ ہے جو اپنی صلاحیت اور اپنے وسائل کو اپنے مادی مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرے، اس میں عقیدہ کی اصلاح ودرستگی، اخلاقیات کی درستگی، انسانی سلوک کی درستگی اور انسانی اقدار وروایات کے پاس ولحاظ کی تعلیم نہیں دی جاتی ہے۔

مغربی فلسفہ تعلیم میں اعلی زندگی کا تصور یہ ہے کہ طاقت وقوت کے وسائل اور خوشحالی وفارغ البالی کے مواقع مہیا ہوجائیں اور بشری تقاضوں اور انسانی ضروریات کی تکمیل کی انسان کے اندر صلاحیت وقدرت پیدا ہوجائے، یورپین تعلیمی وتربیتی تصور صرف انسان کی ذات تک محدود ہے اسے انسانی معاشرہ کی چنداں فکر نہیں اور نہ ہی مشترک انسانی حقوق اور معاشرتی وباہمی معاملات سے کوئی سروکار ودلچسپی، بلکہ یورپین تصور تعلیم میں انسان اپنی خواہشات ومرضیات کی تکمیل کے لئے وسائل کے اختیار میں آزاد ہے، وہ کسی اخلاقی بندش اور انسانی قدروں کا پابند نہیں، اس یورپین تصور کی وجہ سے ان معاشروں میں باہمی منافست ورسہ کشی، استحصال، خودغرضی، مفاد پرستی، موقع پرستی، اخلاقی بے راہ روی وانارکی، آوارگی، مصلحت پسندی، انانیت اور غرور وتکبر جیسی اخلاقی بیماریاں عام ہورہی ہیں، مغربی مفکرین تعلیم کو اخلاقی تربیت سے الگ رکھتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس ان کے نزدیک بچہ کے طبعی رجحانات اور فطری تقاضوں کی رعایت ضروری ہے اور اس کی تکمیل کے لئے اس کو مطلق آزادی دینے کے وہ داعی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بچہ کو اپنے انسانی تقاضوں اور بشری خواہشات کی تکمیل کے وسائل کے اختیار میں آزاد چھوڑ دینا چاہئے، وہ جس طرح چاہے اپنی خواہشات کی تکمیل کرے، اسے کسی اخلاقی ضابطہ یا قانون کا پابند کیا جائے، موجودہ نظام تعلیم کی بنیاد انہی مغربی نظریات وافکار اور خالص مادی تصورات پر ہے جن میں اخلاقی قدروں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مذہب واخلاق، معاشرتی روایات اور انسانی واخلاقی قدروں کے باغی یورپین مادہ پرست فلاسفہ کے نظریات وتصورات پر مبنی مادہ پرستانہ نظام تعلیم وتربیت کی وجہ سے آج تعلیم ایسا مثالی اور ذمہ دار انسان پیدا کرنے سے قاصر ہے، جو صحیح خطوط اور صالح بنیادوں پر معاشرہ کی تعمیر کرے، اور زندگی میں اعلی انسانی قدروں کو فروغ دے، اس میں حقوق العباد اور حقوق اللہ کی ادائیگی کا احساس موجود ہو لیکن مغربی اور مادی نظام تعلیم کی وجہ سے آج کا انسان شتر بے مہار ہوگیا ہے کہ سوائے طاقت وقوت کے استعمال اور قانونی سختی کے کوئی اور چیز اسے قابو میں نہیں رکھ سکتی، چنانچہ آج تعلیم یافتہ انسان وغیر تعلیم یافتہ انسان میں اخلاق وکردار، سلوک ومعالات، چال چلن، لین دین، گھریلو اور معاشرتی زندگی میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے، دونوں کی شب وروز کی زندگی میں فرق صرف اس طور پر کیا جاسکتا ہے کہ ایک کے پاس علم ہے اور دوسرا اس دولت سے تہی دامن، اس کے برخلاف تعلیم یافتہ انسان کا علم اس کو تعیش، نفس پرستی، لذتوں اور عیاشیوں کا گر سکھاتا ہے، اسے بتاتا ہے کہ وہ اپنی حیوانی خواہشات وجذبات کی کس طرح تکمیل کرسکتا ہے، وہ ذہانت وچالاکی میں، عیاری ومکاری سے کس طرح دوسروں پر غلبہ حاصل کرسکتا ہے، چنانچہ آج کے علمی ادارے، تعلیمی وتربیتی مراکز فساد وبگاڑ اور دہشت گردی کے اڈے بن گئے ہیں، اور تعلیم یافتہ انسانوں کی زندگی جاہل اور ناخواندہ انسانوں سے بدتر ہے۔

آج تعلیم یافتہ طبقہ میں جو خرابیاں اور اخلاقی وفکری انحراف پایا جاتا ہے اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ تعلیم وتربیت کا مقصد غلط سمجھا گیا ہے، تعلیمی وتربیتی کردار کی غلط تشریح کی گئی اور سب سے بنیادی سبب تعلیم کا ملحدانہ فلسفہ ہے جو مادہ پرست اور ملحد مغربی تہذیب کی دین ہے، بدقسمتی سے عالم اسلام نے بھی اسی مادی اور ملحدانہ نظام تعلیم وتربیت اور گمراہ کن تصور حیات کو اپنا رکھا ہے۔

اس مغربی نظام تعلیم میں جو علوم وآداب، خیالات وتصورات، رجحانات وافکار اور فلسفے داخل ہیں وہ ایسے لوگوں کے وضع کردہ ہیں جو علم کے غلط تصور پر مبنی نظام تعلیم کے پروردہ ہیں، ان میں سے اکثر بدظنی، دینی بیزاری، اخلاقی وفکری انحراف کا شکار تھے، چنانچہ ان گمراہ کن عقلی اور ذہنی رجحانات ومیلانات اور غلط انسانی تجربات کا افکار ومذاہب پر اثر پڑا، لیکن افسوس! عالم اسلام نے بھی ان افکار وعلوم اور تصورات ومکاتب فکر کو جوں کا توں قبول کرلیا، اور یہ خیال کیا کہ یہ عقلی وفکری انحراف اور ذہنی بگاڑ وفساد سے خالی ہیں، چنانچہ ان لادینی تصورات ونظریات پر مبنی نظام تعلیم نے اس اسلامی معاشرہ میں فکری کشمکش پیدا کردی، جس کی اپنی ایک نمایاں شناخت ہے، عائلی اور معاشرتی نظام ہے، ذہنی تربیت وتشکیل کا ایک خاص نظام ہے، اس کی اپنی قدریں اور روایات ہیں، انسان اور کائنات کا اس کے پاس ایک متوازن اور صالح تصور ونظام اور خاص نقطہ نظر ہے، وہ تمام برائیوں اور خرابیوں کے باوجود ایک خدا کا تصور رکھتا ہے، جو اس عالم رنگ وبو کا خالق وموجد اور اس کا نگہبان ہے، وہ تمام چیز پر قادر اور سب سے بے نیاز، مگر دوسرے اس کے محتاج ہیں، اس کے ہر ہر فرد کے رگ وریشہ میں یہ احساس وشعور جاگزیں اور ربانی تعلیمات رچی بسی ہیں، اس لئے کہ وہ ابتداء آفرینش ہی سے ایسی چیزیں سنتا اور دیکھتا ہے جو اس کے اس عقیدہ توحید اور تصور خالق کو اس کے نہاں خانہ دل میں مستحکم کرتی ہیں اور اس کے اس یقین کو مزید پختہ کرتی ہیں، کہ وہی تنہا سننے اور دیکھنے والا ہے، غیب کا جاننے والا ہے اور دلوں اور نگاہوں کی خیانتوں سے وہ خوب واقف ہے۔

ذهنی تشکیل وتربیت میں استاد کا کردار اور اسکی اهمیت:

طالب علم کی ذہنی اور فکری تشکیل وتعمیر درسی کتابوں سے نہیں، بلکہ اس کی شخصیت کی تعمیر میں اساتذہ، تعلیمی فضاء، ماحول جس میں وہ سانسیں لیتا ہے، دانشوروں اور مفکرین کی زندگی اور ان لوگوں کی زندگی کا اثر پڑتا ہے، جو بڑے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں، اور قوم میں ان کا اثر ونفوذ ہے، چنانچہ جب استاد کی زندگی، اس کا طرز حیات، معاملہ وسلوک، افکار وخیالات، اس کا تصور کائنات وزندگی اور اس کا طرز عمل کتابوں میں پڑھائے ہوئے اس کے ضابطہ حیات اور تصور کائنات سے مختلف ہوگا، اور اس کی عملی زندگی میں تضاد ہوگا تو طالب علم کے اندر باغیانہ جذبات پیدا ہوں گے، کیونکہ انسان سنی ہوئی باتوں کے مقابلہ میں مشاہدہ پر اعتماد زیادہ کرتا ہے، استاد کے افکار وخیالات اور اس کے طرز زندگی کے طالب علم کی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ درسی کتابوں سے نہیں ہوسکتے، اور غیر شعوری طور پر طالب علم استاد کی زندگی سے متأثر ہوتا ہے، بارہا مشاہدہ میں آتا ہے کہ طالب علم لب ولہجہ، رفتار وگفتار، نشست وبرخاست، خورد ونوش اور زندگی کے دیگر معاملات میں اپنے استاد کے نقش قدم پر چلتا ہے، خصوصاً اس وقت جب کہ استاد ایک ممتاز شخصیت اور مؤثر ودلکش صفات کا حامل ہو، تو طالب علم زندگی کے تمام امور میں استاد کو ہی اپنا نمونہ اور آئیڈیل بنانے کی کوشش کرتا ہے، چنانچہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ نظام تعلیم میں استاد کا انتخاب نصاب تعلیم سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔

نظام تعلیم میں استاد کے بعد دوسرا اہم عنصر ذرائع ابلاغ اور اس میدان میں امتیاز رکھنے والے اہل فن ہیں، ذرائع ابلاغ کے تینوں شعبے صحافت، ریڈیو اور نوجوانوں کی ذہنی وفکری تشکیل وتعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں، یہ تعلیم وتربیت کے معاون کی حیثیت رکھتے ہیں، اور نصاب تعلیم، استاد اور مدرسہ کے تعلیمی ماحول کے بعد دوسرے نمبر پر آتے ہیں۔

تعلیم وتربیت کا اخلاقی فلسفہ، نصاب تعلیم کی تبدیلی وتیاری اور مدرسہ واسکول کے ماحول میں دینی واصلاحی روح کا غلبہ، یہ باتیں طلبہ میں اسلامی، رجحان پیدا کریں گی اور اس معاشرہ کو اسلامی رنگ میں رنگ دیں گی، جو اپنے طرز زندگی کا تعین اساتذہ اور تعلیم یافتہ حضرات کی زندگی کی روشنی میں کرتا ہے، لیکن اگر اس عمل میں ذرائع ابلاغ اور ادب وفن کا تعاون حاصل نہ ہو تو یہ اسلامی رنگ طلبہ اور ان کے متعلقین ہی میں محدود ہو کر رہ جائے گا اور عام معاشرہ کرپشن کا شکار ہو جائے گا، کیونکہ یہ شعبے مغربی اداروں کے ماتحت ہیں، اور الحاد ولادینی تصور زندگی کے تابع ہیں، چنانچہ اگر کتابیں فکر کی تشکیل کرتی ہیں تو ذرائع ابلاغ شوق کی آبیاری کرتے ہیں، انسان کے اندر کچھ چیزوں سے محبت پیدا کر دیتے ہیں، اور کچھ دوسری چیزوں کو ناپسندیدہ بنا دیتے ہیں، کبھی آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، تو کبھی تردد اور شک ویقین، کبھی انسانی شعور کو پروان چڑھاتے ہیں اور کبھی انسان کے شعور واحساس کو بگاڑ دیتے ہیں، عقل وفکر کی طرح انسانی شعور کی بھی بڑی اہمیت ہے، بہرحال ذرائع ابلاغ نے زندگی کے تصور کی تعمیر، ذوق کی تشکیل اور حسن وقبیح اور خیر وشر میں تفریق کی صلاحیت پیدا کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔

اشتراکی ملکوں نے ان سارے وسائل پر پوری توجہ دی اور ان کو کلی طور پر نیشنل لائز کرنے کی کوشش کی، چنانچہ اشتراکی ملکوں میں تعلیمی ادارے اور ذرائع ابلاغ حکومت کی پالیسی اور نظام کے تابع ہیں، اسی وجہ سے ان ملکوں میں اشتراکی فلسفہ کے مطابق زندگی کو پیش کیا جاتا ہے، تفریح طبع اور تسکین جذبات کا سامان فراہم کیا جاتا ہے، عریاں تصویریں، فحش لٹریچر، اشتعال انگیز کہانیاں اور جرائم کے واقعات نشر کر کے دل بستگی کا سامان فراہم کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اشتراکی افکار وخیالات کو رواج دیا جاتا ہے۔

صحافت کتاب اور استاد کا متبادل ہے، موجودہ صحافت مطلقاً آزاد ہے، وہ اخلاقی اقدار وروایات، فکری اصول وضوابط اور صالح نظریات کی پابند ہے، اس کو موجودہ دور میں انڈسٹری کا نام دیا گیا ہے، اور اس کی وجہ سے اس کا مزاج ہی کاروبار کا مزاج بن گیا ہے، آج مختلف اخباروں کے درمیان سنسنی خیز اور پراسرار مواد کی اشاعت کی ریس میں جو مناظر آتے ہیں وہ اسی دولت کی ہوس کا نتیجہ ہیں، موجودہ صحافت افکار وخیالات کو پراگندہ کرنے اور فواحش ومنکرات کی نشر واشاعت کا کامیاب ترین ذریعہ بن گئی ہے، بڑے بڑے صحافتی اداروں، اخباری ایجنسیوں، تجارتی کمپنیوں اور مواصلاتی وزارتوں کا مقصد صرف اور صرف پروپیگنڈہ کو ہوا دینا ہے، یہ اخبارات اپنا مواد صہیونی ایجنسیوں اور اسلام مخالف عالمی خبر رساں ایجنسیوں سے اخذ کرتے ہیں، اسی وجہ سے ذرائع ابلاغ عالم اسلام کی خراب اور گمراہ کن تصویر پیش کرتے ہیں، مسلم معاشرہ کی برائیوں اور خرابیوں کی خوب تشہیر کر کے یورپین زندگی کو محبوب اور پسندیدہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

آج مسلم معاشرہ کو اسلامی نظام تعلیم جو نصاب اور معیاری استاد اور ماحول تعلیم پر مشتمل ہے، ان کے ساتھ ایسی صحافت کی بھی ضرورت ہے جو نہ تو مغربی صحافت کی طرح مطلقاً آزاد ہو کہ جس کا ہر نامہ نگار جب اور جس طریقہ سے چاہے اپنے ہر اچھے برے خیال کو لوگوں کے سامنے پیش کرے اور نہ اشتراکی صحافت کی طرح مقید ہو جو عوام کو بیرونی دنیا سے بالکل بے خبر رکھتی ہے، بلکہ ایک مثبت، تعمیری، بامقصد اور اقدار وروایات کی پابند صحافت ہو، جسے اپنے اصول ومبادی پر پورا یقین ہو، اور اپنی ذمہ داریوں کا خوب احساس ہو، تعمیری تنقید کا پورا فریضہ بھی انجام دیتی ہو اور قارئین کی نیک خواہشات کی تکمیل بھی کرتی ہو، اسلامی تصور زندگی کے منافی نہ ہو، اس میں ایسا مواد شائع کیا جائے جس سے اسلامی غیرت وحمیت، اخوت وبھائی چارگی اور عالم اسلام سے محبت ووابستگی کے جذبات فروغ پائیں، عالم اسلام کے مسائل کا تعارف کرایا جائے، اور پھر ان کا حل بھی پیش کیا جائے اور وہ ایک عظیم مشن اور تعمیری وصالح پیغام کی حامل ایک ذمہ دار صحافت ہو۔

ذرائع ابلاغ کی دوسری قسم ریڈیو اور ٹیلی ویژن ہے، ان کا دائرہ

اثر صحافت کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہے کیونکہ صحافت سے صرف وہی لوگ مستفید ہوسکتے ہیں جو پڑھنا لکھنا جانتے ہوں، یا پڑھے لکھے لوگوں سے انکا تعلق ہو لیکن ریڈیو سے ہر شخص خواندہ وناخواندہ، خرد وکلاں، مرد وعورت سبھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور ٹیلی ویژن کا دائرہ اثر اس سے بھی زیادہ وسیع ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ حوادث وواقعات اور مناظر مصور پیش کئے جاتے ہیں، اور موجودہ زندگی ان مؤثر وسائل سے الگ بھی نہیں رہ سکتی، کیونکہ یہ انسان کو بیرونی دنیا سے باخبر کرتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ میں ویڈیو، فلمیں اور ڈرامے بھی ہیں، ان کا بھی ذہن اور ذوق کی تعمیر میں بڑا حصہ ہے، یہ انسانی معاشرہ کو رجحانات، فیشن زندگی کے مناظر اور لوگوں کے سلوک ومعاملات سے واقف کراتے ہیں، ان وسائل کی تاثیر کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ رامائن اور مہابھارت ٹی وی سیریل نے ہندوؤں میں ان کی قدیم تاریخ سے وابستگی پیدا کردی، بلکہ ہندوؤں میں ان کی قدیم شخصیات اور ان کے کارناموں کا چرچا عام ہوگیا اور عام مجلسوں میں ان کے قصے اور واقعات بیان کئے جانے لگے، چنانچہ ٹی وی سیریل جو تاثیر رکھتے ہیں وہ درسی کتابوں میں نہیں ہوسکتی۔

مسلمانوں کے نئے معاشرہ کی تعمیر وتشکیل اور نئی نسل کی تعلیم وتربیت کے لئے ان مؤثر اور فعال جدید وسائل کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے، تخریبی تنظیمیں اور ادارے اپنے تخریبی اغراض ومقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے ان وسائل کو استعمال کرتے ہیں، درحقیقت یہ وسائل جاسوس ہیں جو گھر گھر داخل ہوچکے ہیں، ان وسائل میں اخلاقیات کا تصور بالکل مفقود ہے، یہ جرائم کی خوب تشہیر کرتے ہیں اور خیر کے بجائے شر کو رواج دیتے ہیں، شر کو فضل کمال کا نام دیتے ہیں، دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ بگاڑنے میں کتاب سے زیادہ وسائل ابلاغ نے کام کیا ہے۔

اس لئے تعلیمی نظام کی طرح ذرائع ابلاغ کو بھی اسلامی تصور کے مطابق ڈھالنا اور ان کی اصلاح کرنا ضروری ہے تاکہ اہل قلم اور فنکاروں کی ایک ایسی نسل تیار ہوجائے جو اسلامی روح اور فکر کی حامل ہو، اور کائنات اور انسان کے متعلق اسلام کے تصور سے ہم آہنگ ہو۔

تربیت کے دائرہ میں ایک پہلو اور ہے وہ اوقات فراغت میں وقت گزاری کا لٹریچر، قصہ، شعر، ڈرامہ، سفرناموں کی شکل میں ان عنصر کی طرف بھی اسلامی ذہن کے لوگوں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے، ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو فاسد لٹریچر کا بدل ہو۔

نظام تعلیم کی اصلاح اور ذرائع ابلاغ کو اسلامی رنگ میں رنگنے کے ساتھ ساتھ ثقافتی پروگراموں پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ ان وسائل کا تعلیم وتربیت سے گہرا تعلق وربط ہے بلکہ یہ اس کا ایک جزء ہیں اور ذرائع ابلاغ کی طرح ان کا بھی ذہن سازی اور شخصیت کی تعمیر میں بڑا مؤثر رول ہے، اس کو تعلیم کا ایک شعبہ قرار دیا گیا ہے، موجودہ زمانہ میں سامان تفریح طبع اور کھیل کود سے شغف ووابستگی جنون کی حد تک بڑھ گئی ہے، اور اس میدان میں پانی کی طرح دولت بہائی جارہی ہے، سامان تفریح طبع اور کھیل کود کے وسائل سے یہ دلچسپی اور لگاؤ رومی تہذیب وتمدن کی دین ہے، رومی عہد میں لوگ ہر قسم کے کھیل تماشوں کے غیر معمولی شائق تھے، جب جب معاشرہ میں جنگوں، آفات وحوادث اور قحط وافلاس کی وجہ سے مایوسی، بے چینی، محرومی اور تنگ دستی بڑھتی تو عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے مختلف قسم کے کھیل کود کے مقابلے کرائے جاتے تھے، رومیوں نے تفریح طبع، تعیش، عیش وطرب اور دل لگی کے مختلف وحشیانہ کھیل ایجاد کررکھے تھے، آج فٹ بال اور کرکٹ ورلڈ کپ کے دوران پوری دنیا خصوصاً ایشیائی ملکوں کا جو حال ہوتا ہے اس سے کھیل کود کی غیر معمولی تاثیر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، بلکہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ کھیل کا جنون بڑھتا ہی جارہا ہے، نوجوان نسل کا اس سے شغف تعلیم کے شغف سے بڑھ گیا ہے، عالم اسلام کے مختلف ملکوں میں وباء کی طرح عام ہوگئے ہیں، بلاد عربیہ بھی اس سے محفوظ نہیں، اس میں وہ ممالک بھی مبتلا ہیں جہاں

ہسپتال، تعلیمی اداروں، کارخانوں، دفاع، قومی ذرائع معاش، معاشرتی عدل وانصاف اورامن عامہ کے قیام پرتوجہ دینے کی زیادہ ضرورت تھی، ان ملکوں میں اربوں کھربوں ڈالر تفریح طبع اور کھیل کود کے وسائل پرخرچ کئے جارہے ہیں، اور عوام وخواص تمام دوسرے اہم امور سے صرف نظر کرکے عیش وطرب اورتفریح طبع میں مشغول ومنہمک ہیں۔

عالم اسلام اس یلغار سے محفوظ نہیں، بلکہ علمی ومادی ترقی سے زیادہ وہاں تہذیبی رجحانات کی تقلید میں ایک دوسرے کے درمیان منافست پائی جاتی ہے اورمختلف ملکوں سے فنکاروں کی ٹیمیں آتی ہیں، اور تعلیمی اداروں اور کلبوں میں ثقافتی جشن منائے جاتے ہیں اوران ثقافتی پروگراموں پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کی جاتی ہیں، کھیل کود اورتفریح طبع سے بڑھتی دلچسپی اورشغف کی وجہ سے انسان سنجیدگی، سعی وکوشش اور سنجیدہ ومتوازن فکروسوچ سے دور ہوتا جارہا ہے۔

آج عالم اسلام کو اپنے اسلامی تشخص، اپنے اصول ومبادی اور بلند اسلامی قدروں کی حفاظت کے لئے اورامتیازی شان باقی رکھنے کے لئے ان تمام میدانوں میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے، تاکہ دینی واسلامی اصول ومبادی کی روشنی میں تعلیم وتربیت کے جدید وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے، اورزندگی کے نئے تقاضوں اورمطالبوں کی رعایت کرتے ہوئے ایسا نظام تعلیم اورطریقہ تعلیم بنایا جائے جس سے مسلمانوں کی نئی نسل اسلامی تشخص اوراسلامی اقدار وروایات کی محافظ بن سکے اور زمانے کے چیلنجوں کا بھرپور مقابلہ کرسکے اور زندگی کے تمام میدانوں میں اسلام کی آفاقیت، ہمہ گیریت، جامعیت اورصالح انسانی معاشرہ کی تعمیر کی صلاحیت کا ثبوت دے، یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب تعلیمی اورتربیتی نظام کو اسلامی تصور کے مطابق ڈھالا جائے اورتعلیم کے جدید وسائل سے اس کی روشنی میں استفادہ کرکے ایسا نظام مرتب کیا جائے جس میں اسلامی روح غالب ہواورزمانہ کے نت نئے فتنوں، خطرات اورچیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی پوری صلاحیت ہو۔

❁❁❁❁❁

مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی کی
اہم تصانیف

۱- مختصر تجوید القرآن (بروایت حفص اردو) ۲۰/روپے
۲- بچوں کی تمرین التجوید (تجوید کے قواعد، مشق اور طریقہ تدریس اردو) ۱۰/روپے
۳- جیب کی تجوید (تجوید کے ضروری قواعد کا پاکٹ سائز مجموعہ) ۵/روپے
۴- ریاض البیان فی تجوید القرآن (بروایت حفص عربی) ۲۰/روپے
۵- رہنمائے سلوک وطریقت ۲۰/روپے
۶- مراجع الفقہ الحنفی ومیزاتہا ۱۰/روپے
۷- الامامۃ فی الصلاۃ ومسائلہا واحکامہا ۳۰/روپے
۸- التدخین بین الشرع والطب ۲۰/روپے ۹- حیات عبدالرشید ۲۰۰/روپے
۱۰- سیرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ ۱۰۰/روپے
۱۱- تذکرہ مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ ۱۰۰/روپے
۱۲- تذکرہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ۱۰/روپے
۱۳- تذکرہ علامہ سید سلیمان ندویؒ ۱۰/روپے
۱۴- تذکرہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ۱۰/روپے
۱۵- چند مایہ ناز اسلاف قدیم وجدید ۱۵۰/روپے
۱۶- مقالات ومشاہدات ۳۰/روپے ۱۷- مکتوبات اکابر ۳۰/روپے
۱۸- چندہ دینے، دلوانے اور لینے کے آداب واصول ۱۰/روپے
۱۹- افکار دل (۳۰ تقریروں کا مجموعہ) ۱۰۰/روپے
۲۰- تذکرہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ ۲۰۰/روپے
۲۱- مدارس کا نظام تحلیل وتجزیہ ۲۰/روپے
۲۲- سیرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ۱۰/روپے
۲۳- میری والدہ مرحومہ (نقوش وتأثرات) ۱۵/روپے
۲۴- قادیانیت نبوت محمدیؐ کے خلاف بغاوت ۱۰/روپے
۲۵- لڑکیوں کی اصلاح وتربیت ۱۵/روپے
۲۶- تذکرہ حضرت حافظ عبدالرشید رائے پوری ۱۰/روپے
۲۷- نقوش حیات حضرت مولانا عبدالرحیم متالا ۲۰۰/روپے
۲۸- ملفوظات حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ ۲۵/روپے
۲۹- تصوف اوراکابر دیوبند ۲۰/روپے
۳۰- امامت کے احکام ومسائل ۱۰۰/روپے
۳۱- فقہ حنفی کے مراجع اوران کی خصوصیات ۱۰/روپے
۳۲- اللہ ورسول کی محبت ۲۰/روپے
۳۳- ماں باپ اوراولاد کے حقوق ۲۰/روپے
۳۴- عقائد اورارکان اسلام ۲۰/روپے
۳۵- Rules of Raising Funds ۱۰/روپے
۳۶- A Short Biography of Prophet Muhammad ۱۰/روپے

ملنے کا پتہ

مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفرآباد، سہارنپور (یوپی)

مسائل میراث

پوتوں کی وراثت

مولانا مفتی عبید اللہ اسعدی استاد جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ

یتیم پوتے کی وراثت کا موضوع مسلمانوں کا عائلی مسائل میں بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ہمارے ملک میں ایک طویل عرصہ سے موضوع بحث بنا ہوا ہے، حتی کہ تقسیم ہند سے قبل اور انگریزی عہد میں بھی اس بابت گفتگو ہوتی رہی اور اس وقت کے ہمارے ممتاز علماء نے اپنے حالات ووسائل کے اعتبار سے اس پر توجہ دی اور امت کی رہنمائی کی، معاملہ یہ ہے کہ عموماً لوگ اس مسئلہ میں جذباتیت اور صرف رحم وترحم کی سوچ رکھتے ہیں اور مسئلہ کو سمجھنے میں ''یتیم اور پوتے'' تک رہ جاتے ہیں، وراثت، اس کی حقیقت اور حکمت کو سمجھنے کی زحمت نہیں کرتے، نتیجتاً ان کو شریعت کے اس حکم میں ظلم وزیادتی کا پہلو نظر آتا ہے اور بقول بعض ممتاز ارباب افتاء ۲۷/صورتوں میں سے محرومی کی ایک شکل کو اہمیت دیتے ہیں اور ۲۶/سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں، پھر یہ کہ دور دور سے سنتے، دیکھتے اور سمجھتے ہیں، جو لوگ مسئلہ کو صحیح طور پر جانتے، بتاتے اور سمجھاتے ہیں ان کے قریب جا کر ان سے سننے وسمجھنے کی سعی نہیں کی جاتی، جو حق وحقیقت ہے، اس کا بھی علم نہیں ہوتا اور ایک خاص صورت کے حکم کو عام اور عمومی سمجھ کر اسلام اور علماء اسلام کے حق میں الزام تراشی تک نوبت آجاتی ہے۔

دادا کے ترکہ میں پوتے کا حصہ اور پوتے کی شمولیت کی بہت سی شکلیں ہیں، جن میں صرف ایک شکل محرومی کی ہے اور بقول استاذی مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمی ۲۶/شکلیں حصہ پانے اور وراثت میں شمولیت کی ہیں، لیکن اس ایک شکل کے پروپیگنڈے نے ذہن ایسا خراب کر دیا ہے کہ شریعت کا مستحکم ومستحسن نظام ظلم نظر آتا ہے، جبکہ ہماری شریعت شریعت اسلامیہ وشریعت محمدیہ کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے جانوروں کے بھی حقوق اس درجہ بتائے ہیں کہ ان کو ادا کر کے آدمی جنت ومغفرت کا مستحق قرار پاتا ہے، اور ان کو ضائع کر کے اپنی آخرت کو برباد کرتا ہے، تو انسانوں کے حقوق کا کیا کہنا کمزور سے کمزور طبقہ وفرد کو حقوق دیئے ہیں، ان کی فکر وخیال اس حد تک کیا ہے کہ ان کو آسمان تک پہنچا دیا ہے، کتاب وسنت میں معاشرہ کے ہر کمزور فرد وطبقہ کی مدد ونصرت اور خیال وفکر کی ہدایت جا بجا موجود ہیں، جس میں غریب ومسکین او ریتیم وبیوہ سب شامل ہیں، جس شریعت کے نبی نے خود یتیمی کی زندگی گزاری ہو اور اس حال کو سمجھا اور پرکھا ہو اور جس کا کردار قبل نبوت بھی یہ رہا ہو کہ اولین وحی کی آمد پر آپ کو جو ایک قسم کی فکر وپریشانی لاحق ہوئی تو آپ کی جانثار ووفا شعار زوجہ مطہرہ نے آپ سے فرمایا: فوالله لایخزیك الله ابداً، فوالله انك لتصل الرحم وتصدق الحدیث وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق"۔(بخاری)

جس نبی کا یہ فرمان ہو "الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاهد فی سبیل الله او القائم اللیل والصائم النهار" اور "من قبض یتیماً من بین المسلمین الی طعامه وشرابه ادخله الله الجنة البته"۔(ترمذی)

"انا وکافل الیتیم فی الجنة هکذا، واشار باصبعیه السبابة والوسطی"۔(بخاری)

جس کی لائی ہوئی کتاب میں یہ ارشاد باری تعالی ہے: "لکن البر من امن بالله والیوم الآخر والملائکة والکتاب والنبیین واتی المال علی حبه ذوی القربی والیتامی والمساکین وابن

السبیل والسائلین وفی الرکاب"۔(سورۂ بقرہ)

اوراس سے بڑھ کر"واماالسائل فلاتنھر" کے ساتھ اس سے پہلے "امااالیتیم فلاتقھر" فرمایا گیا ہے۔(سورۂ ضحیٰ)

اس مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھنے اور سمجھانے کے لئے فلسفہ میراث اور وراثت اور شریعت کے نظام وراثت کو سمجھنے کی ضرورت ہے، جو فطرت کے عین مطابق ہے اور ذی شعور انسانوں کے عقل وفہم کے عین مناسب اور اسی کے ساتھ رحم وترحم، دوسروں کی مدد ونصرت اور خیال وکفالت کی نسبت سے شریعت کا جو نظام ومزاج ہے اس کو بھی پورے طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ شریعت نے ایک طرف وراثت کے مضبوط اصول بنائے ہیں کہ ہر صاحب حق اور واقعی پورے طور پر ملے اور دوسری طرف وراثت کے نظام کو صحیح طور پر جاری کرنے کی صورت میں اگر کوئی ضرورت مند محروم رہ رہا ہو تو وہ وراثت سے محرومی کی بنا پر ضائع نہ ہو بلکہ اس کی پوری طور پر کفالت کی جائے اور اس کی جملہ ضروریات کو پورا کرنے کی فکر کی جائے۔

ہر اہم چیز کے کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں، دنیا والوں کے نزدیک بھی ہوتے ہیں، چنانچہ دنیا کا نظام وراثت بھی خواہ کسی قوم وملک کا ہو یا کسی مذہب کا آزاد اور بے سروپا نہیں ہے بلکہ محدود ہے، اور اس کے کچھ حدود ہیں، انہیں کی بنیاد پر وراثت کی تقسیم ہوتی ہے اور ہر رشتہ دار اپنا حق پاتا ہے اور شریعت اسلامیہ نے تو ہر چیز کو منضبط ومنظم کرکے پیش کیا ہے تاکہ عدل وانصاف قائم ہو اور ظلم وجور کا دفعیہ کیا جاسکے۔

شریعت کا نظام وراثت یہ ہے کہ وارثین کو ہر حال میں ترکہ ملے ہی، ضروری نہیں ہوتا کم وبیش بھی ہوتا ہے اور محرومی کی شکل بھی پائی جاتی ہے۔

(۱) ہر دور وقریب کا رشتہ دار وارث نہیں ہوتا بلکہ صرف قریبی قرابت دار ہی وارث ہوا کرتے ہیں، وراثت کے نظام کو قرابت سے جوڑا گیا ہے قرابت داروں کی ضرورت سے نہیں، ورثہ یا ان میں سے بعض خواہ کتنے ہی مالدار کیوں نہ ہو تر کہ میں ان کا مقرر حق وحصہ ان کو ملنا ہے، اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور مورث کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ ایسا کوئی کام کر جائے جس کی وجہ سے مستحق وارث محروم ہو جائے، حضرت سعد بن ابی وقاص کا واقعہ بخاری میں مذکور ومعروف ہے کہ وہ حجۃ الوداع کے موقع پر شدید بیمار ہوکر مایوس ہوگئے تو انہوں نے اپنے کل مال کا صدقہ کرنا چاہا، اتفاق سے اس وقت ان کی ایک بیٹی تھی جو مالدار تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بمشکل تہائی کے صدقہ ووصیت کی اجازت دی اور ارشاد فرمایا جس میں بڑی عبرت وتعلیم ہے:" انك ان تذروورثك اغنیاء خیر من أن تترکھم عالة یتکففون الناس"۔

(۲) ان قریبی قرابت داروں کو اس طرح محدود کیا گیا ہے کہ وہ میت کے اہل خانہ، ماں باپ، میاں وبیوی اور اولاد ہیں، ماں باپ کے زمرہ میں ان سے اوپر کے لوگ، اولاد کے زمرے میں ان سے نیچے یعنی اولاد در اولاد، نیز ماں باپ کی اولاد کو بھی اسی فہرست میں رکھا گیا ہے، یعنی بھائی وبہن کو اور کچھ اور لوگ بھی ورثاؤں کی فہرست میں شامل ہیں۔

(۳) وارث ہونے والوں میں کچھ لوگوں کے حصے متعین کر دیئے گئے ہیں اور کچھ کو حصے کی تعین کے بغیر وارث قرار دیا گیا ہے مثلاً زوجین میں سے ہر ایک حصہ متعین ہے، والدین میں سے ہر ایک کا متعین ہے، لڑکی یا بہن (لڑکے و بھائی) کے بغیر ہو تو ان کا حصہ متعین ہے اور اگر لڑکی کے ساتھ لڑکا یا بہن کے ساتھ بھائی ہو تو مرد کو عورت کا دوگنا دیا گیا ہے۔

(۴) ایک اہم ضابطہ یہ ہے کہ مستحق ورثہ میں قریبی کی موجودگی میں دور والے کو وراثت نہیں ملتی، اسی لئے اولاد کے ہوتے ہوئے بھائی بہن کو نہیں ملتا، اور حقیقی بھائی وبہن کے ہوتے ہوئے باپ شریک بھائی بہن کو حصہ نہیں ملتا۔

(۵) اسی طرح جس کی قرابت بالواسطہ ہو تو واسطہ کے ہوتے

ہوئے اس کو حصہ نہیں ملتا، باپ موجود ہے تو دادا نیز بھائی و بہن مستحق نہیں ہوتے، صلبی اولاد موجود ہے حقیقی بیٹا و بیٹی ہو تو اولاد کی اولاد کو عموماً نہیں ملتا۔

(۶) پوتے و پوتیوں کی قرابت بالواسطہ ہے ، واسطہ موجود ہو تو پوتے و پوتی محروم ہوتے ہیں یعنی بیٹے اگر موجود ہوں تو پوتے و پوتی محروم رہتے ہیں، خواہ موجود بیٹے کی اولاد ہو یا دوسرے مرحوم بیٹے کی (جو اپنے باپ سے پہلے مر گیا تھا)۔

(۷) واسطہ موجود نہ ہو یعنی بیٹا تو بیٹوں کی اولاد بہر حال وارث ہوتی ہے خواہ صرف پوتے ہوں یا صرف پوتیاں ہوں یا دونوں ہی ہوں، اگر صرف پوتے ہوں تو وہ عصبہ پوتے ہیں متعین حصہ کے مستحق وارثوں کے بعد بچا ہوا ترکہ سب ان کا ہوتا ہے، اگر ان کے ساتھ پوتیاں بھی ہوں تو پوتے و پوتیوں کے درمیان: "للذکر مثل حظ الانثیین" کے مطابق تقسیم ہوتی ہے۔

(۸) حتی کہ اگر صرف پوتیاں ہیں، اور بیٹوں میں کوئی زندہ نہیں ہے تو پوتیاں حقدار وحصہ دار ہوتی ہیں، دو یا زائد ہوں تو دو تہائی ان کو ملتا ہے، اگر ایک پوتی ہو تو آدھے ترکہ کی وہ مستحق ہوتی ہے۔

(۹) یہی نہیں اگر ایک شخص کا انتقال ایک لڑکی اور ایک پوتی چھوڑ کر ہوتا ہے، تو لڑکی چونکہ اقرب ہے تو اس کو آدھا ترکہ ملتا ہے اور ترکہ کا چھٹا حصہ پوتی کو ملتا ہے، جیسے کہ اگر صرف ایک پوتی اور بہن ہو تو پوتی کو آدھا اور ترکہ کا چھٹا حصہ بہن کو ملتا ہے۔

(۱۰) پوتا و پوتی بیٹے و بیٹی کی طرح ہی وارث ہوتے ہیں اور جیسے بیٹا و بیٹی کو ترکہ میں حصہ ضرور ملتا ہے، محرومی کا سوال ہی نہیں، اسی طرح اگر کسی کے انتقال کے وقت اولاد میں بیٹا و بیٹی نہ ہوں البتہ پوتا و پوتی دونوں یا ایک تو وہ اپنے باپ کی طرح شریعت کے ضابطہ کے مطابق وارث ہوتے ہیں۔

(۱۱) ایک آدمی کا انتقال اس حال میں ہو کہ صرف ایک پوتا ہو اور بیوی و ماں باپ نہ ہو تو اس کا کل ترکہ پوتے کو ہی ملتا ہے۔

(۱۲) ایک آدمی کا انتقال اس حال میں ہو کہ دو یا زائد لڑکیاں اور ایک پوتا ہو تو لڑکیوں اور دیگر ذوی الفروض کو دینے کے بعد مابقیہ پوتے کو ہی ملتا ہے۔

(۱۳) مرتے وقت صرف بیوی اور پوتا ہو تو بیوی کے حق کے بعد سب پوتے کا ہی ہوتا ہے۔

(۱۴) قرآن کریم میں آیت میراث میں ورثہ کا حق وحصہ بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے اولاد کا تذکرہ ہے، جس کے تحت بالاتفاق صلبی اولاد کے ساتھ بیٹوں کی اولاد بھی داخل وشامل ہے جب کہ آدمی کے مرتے وقت بیٹے زندہ نہ ہوں بلکہ پوتے ہوں اگرچہ ساتھ میں بیٹیاں بھی ہوں، ملاحظہ ہوں سورۂ نساء کی آیت:

"یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِیٓ اَوۡلَادِکُمۡ لِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ" امام بخاری نے اپنی صحیح میں فرائض ومیراث کے بیان میں سب سے پہلے اسی آیت کا تذکرہ کیا ہے اور آگے وارثوں کا ذکر کرتے ہوئے اولاد، بیٹوں اور بیٹیوں کا تذکرہ دوسروں سے پہلے کیا ہے، اور اس کے بعد مرنے والے کے بیٹے کے موجود نہ ہونے کی صورت میں پوتوں کا تذکرہ کیا ہے اور اس بیان میں حضرت زید بن ثابت کا ارشاد نقل کیا ہے جس پر پوری امت متفق ہے: " ولا یرث ولد الابن مع الابن" ایسے ہی بیٹے کے ساتھ اگر پوتی ہو تو نصف بیٹی کا اور ایک چھٹا حصہ پوتی کا اس کا بھی تذکرہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ پوتے و پوتیاں آدمی کی اولاد ہی ہوتی ہیں اگر اس حیثیت سے شریعت نے ان کا پورا خیال کیا ہے، مورث زندہ ہے تو اس پر ذمہ داری اور مر گیا تو اس سے ان کو وراثت ملتی ہے اور جیسا کہ آچکا ہے دسیوں صورتوں میں پوتے و پوتی میراث میں حصہ دار وحقدار ہوتے ہیں، بس ایک صورت ان کی محرومی کی ہے، یہ محرومی وراثت وترکہ میں حصہ کی ہے، شریعت کے مقرر کردہ ضابطوں کی وجہ سے اور وراثت کے اصول ونظام کی وجہ سے کہ مرنے والے کی حقیقی اولاد بیٹا جب موجود ہے جو اقرب ہے تو پوتے و پوتی کو ضیاع کے لئے چھوڑ دیا

جائے گا اور ان کی کفالت وخبر گیری کا کوئی نظام شریعت نے نہیں رکھا، ایسا نہیں ہے، شریعت نے ان کی نگہداشت، کفالت، تربیت، گزر بسر کی فکر وذمہ داری کا پورا پورا نظم کیا ہے، دنیا کے ہر نظام سے بڑھ کر، مورث (دادا) کی زندگی میں بھی اور اس کے بعد کے لئے بھی جس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

(۱) شریعت کا نظام یہ ہے کہ جس انسان کے پاس گزر بسر کے ذرائع نہ ہو اور وہ مجبور ہو (بچہ، نابالغ، مجنون، مفلوج وغیرہ نیز عورت) تو اس کی کفالت گھرانہ وخاندان کے ان قریبی افراد پر ہوتی ہے جو وارثوں میں شمار ہوتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے حق میں فرمایا گیا ہے: "وعلی الوارث مثل ذلك" باپ پر نفقہ کی ذمہ داری کو بیان کرنے کے بعد یہ ذکر کیا گیا ہے، اس صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے اور امام بخاری نے یہ ذکر کیا ہے کہ کوئی شکل نہ بنے تو ماں پر یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے، حالانکہ شریعت نے عورتوں پر اپنے نفقہ کا بوجھ نہیں رکھا (کمانے کا) تو دوسروں کا کیسے ہوسکتا ہے، مگر حالات کے تحت یہ بھی حکم ہے، لہٰذا پوتے کی کفالت دادا پر ہے، وہ ان کی پرورش کا ذمہ دار ہے، جب کہ صاحب وسعت ہو۔

(۲) اور اگر بالفرض وہ صاحب وسعت نہ ہو تو دوسرے ایسے اعزہ جو ورثہ کی فہرست میں ہوں جیسے چچا اور ماموں وغیرہ بھی، یہ سب یتیم کی کفالت کر کے اس کو اس لائق بنائیں گے کہ وہ خود اپنا بوجھ برداشت کر سکے۔

(۳) دادا صاحب وسعت ہے، تو اس کا یہ بھی فرض بنتا ہے کہ اپنے بعد کے لئے بھی پوتوں کے گزر بسر کا نظم کرے یوں کہ اپنی ملکیت کا ایک حصہ پوتوں کو باقاعدہ ہبہ کر دے اور ان کو اس کا مالک بنا دے، اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کہ دادا کی موت کے بعد ترکہ میں پوتوں کا حصہ نہیں ملے گا۔

(۴) اور اگر ہبہ کی صورت نہ اپنا سکے تو کم از کم یہ تو کرے کہ اپنے بعد کے لئے پوتوں کے حق میں وصیت کر جائے کہ اس کے ترکہ میں سے ایک تہائی کے اندر ایک مناسب حصہ پوتوں کو دیا جائے گا تا کہ ان کی محرومی کی تلافی ہو سکے، آدمی کے لئے یوں تو وصیت کرنا ضروری نہیں ہے لیکن خاص حالات میں نہ صرف یہ کہ ایسی وصیت پسندیدہ اور اولی ہو جاتی ہے، بلکہ ضروری ہو جاتی ہے، جبکہ ایسا نہ کرنے میں اس قسم کے ضرورتمندوں کے ضیاع کا اندیشہ ہو۔

(۵) یہ بات آ چکی ہے کہ یتیم کی کفالت صرف دادا کی ذمہ داری نہیں بلکہ دادا نہ ہو یا دادا صاحب وسعت نہ ہو تو چچا کی ذمہ داری وہی ہے جو دادا کی ہے، چچا کو بھتیجوں کی پرورش وتربیت کی پوری فکر کرنی چاہئے اور ضرورت کے مطابق ان کو ہبہ اور وصیت کی شکل اپنانی چاہئے، حتی کہ بالفرض دادا صاحب وسعت ہے مگر اس نے نہ ہبہ کیا اور نہ وصیت تو چچا کا فرض بنتا ہے کہ وہ محروم ومجبور بھتیجے کا خیال کرے اور اس پر خرچ کرے بلکہ مستقبل کے لئے اور مستقل نظم کے لئے ہبہ کی شکل اپنائے۔

(۶) دادا چچا وغیرہ اپنی ذمہ داری محسوس نہ کریں تو خاندان کے دیگر افراد نیز محلّہ اور معاشرہ کے ذمہ دار افراد کو چاہئے کہ دادا اور چچا وغیرہ سے بات کرے ان کو پوتے وبھتیجے کے لئے مناسب نظم پر مجبور کریں۔

(۷) اور ایسی کوئی شکل نہ ہو سکے تو ایسی صورت میں حکومت کے ساتھ ساتھ معاشرہ کے صاحب وسعت افراد کی بھی ذمہ داری ہوتی ہے وہ کمزور، مجبور وبے بس افراد کی زندگیوں کو بچانے اور ان کو قیمتی بنانے کی فکر کریں اور اس کے لئے ایثار وقربانی کریں۔

(۸) آج ضرورت ہے کہ شریعت کے ان ٹھوس ومضبوط اور نہایت مفید کارآمد احکام ونظام کو اچھی طرح سمجھا جائے اور لوگوں کے درمیان اس کو پھیلایا وعام کیا جائے۔

(بشکریہ ماہنامہ "ندائے حرم" دسمبر ۲۰۱۴ء)

❁❁❁❁❁

لائحہ عمل

موجودہ ماحول میں مسلمانوں کیلئے لائحہ عمل

مولانا فضل حق عارف خیرآبادی استاد مدرسہ عربیہ منبع العلوم خیرآباد، مئو

ہندوستان کے موجودہ ماحول میں مذہب کے نام پر باہمی منافرت، ایک دوسرے سے عداوت اور غیر اسلامی وغیر فطری حرکات نے پورے ہندوستان کا سکون اور یہاں کی امن وامان اور فضا کو انتہائی مسموم بنادیا ہے، ہمارا وطن ہندوستان جنت نشان رقابتوں اور عداوتوں کے گرداب بلاخیز میں پھنسا ہے، افتراق وانتشار کے اژدہے انسانوں کی انسانیت کو نگلنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اس خطرناک صورت حال کی بہت بڑی ذمہ دار یہاں کی فرقہ پرست تنظیمیں اور مذہب و ملت کو آلہ بنا کر ہندوستانیوں کے جذبات سے کھیلنے والے افراد ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کو ان ابتر حالات میں اپنے اعمال وکردار اور طرز معاشرت پر بھی غور کرنا چاہئے کہ جس مذہب اور دین کے ہم پیروکار ہیں اس دین اور اس مذہب کو تو "الاسلام یعلو ولا یعلی" کی تاریخی ضمانت ملی ہوئی ہے، پھر حالات مسلمانوں کے حق میں کیوں نہیں ہیں؟ امن وسکون غارت کرنے پر اغیار کیوں تلے ہوئے ہیں؟ مسلمانوں اور ان کے مذہب اسلام کو مشقِ ستم کیوں بنایا جارہا ہے؟۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ آج کا مسلمان اسلامی تعلیمات کو پس پشت ڈالنے کی وجہ سے اتنا بدنام ہوچکا ہے کہ سکون وراحت کی ساری راہیں اس پر مسدود ہوگئی ہیں، اس کا مستقبل تاریک ہی نہیں تاریک ترین نظر آتا ہے، اس کا علاج اغیار کی خوشامد وچاپلوسی اور اعلان ووفاداری نہیں ہے، اس کا علاج اور صحیح علاج قرآن مجید سے عملی طور سے مکمل وابستگی اور استواری کے سوا کچھ بھی نہیں، ہر مسلمان بلند اخلاق کا ناقابل تسخیر حلقہ بلکہ قلعہ تعمیر کرے اور اپنی مذہبی زندگی سے دوسری قوموں کو یقین دلائے کہ اسکا وجود پورے عالم انسانیت کے لئے مفید اور کارآمد ہے تہذیب وتمدن اور پرسکون ماحول کے لئے مسلمان کا وجود دریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہندوستان کے موجودہ ماحول کے تناظر میں نفرت سے نفرت اور دشمنی سے دشمنی پیدا ہونا ایک بدیہی بات ہے، بقول مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط اس چکر سے نکلنے کے لئے نفرت کو محبت سے اور دشمنی کو دوستی سے بدلنے کی ضرورت ہے، آگ کا جواب پانی ہے، زہر کا علاج تریاق ہے، اگر کوئی حق ناشناس ہم سے نفرت وعداوت کا معاملہ کرتا ہے تو ہم اس سے محبت ویگانگت سے ملیں، جس ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی دنیا کو اخوت ومساوات کا سبق دیا ہے اس کی سیرت کو برتنے کی ہم بھرپور کوشش کریں یقیناً نفرت کے خارزاروں میں محبت واخوت کے گل وگلزار کھلیں گے۔

ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہم نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ سے صرف نظر کرلیا ہے، جس ذات والاصفات نے گرتوں کو اٹھایا، پسماندوں اور بچھڑے ہوؤں کو سنبھالا، اگر ہم اس ذات والا کی صفات وسیرت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں تو کیا مجال کہ نفرت کی سنگلاخ اور پتھریلی زمین سے محبت کے گلاب نہ اگیں، اور نہ کھلیں بقول مولانا فارقلیط:

اگر ہندوستانی مسلمانوں کو کوئی تاریخی رول ادا کرنا ہے تو اس کا ایک عملی پہلو یہ ہے کہ ہم میں ہر فرد دوسروں سے شخصی رابطہ اس طرح پیدا کرے کہ مقابل کے دل میں اتر جائے، مقابل کے دماغ میں خود بخود محبت ویگانگت پیدا ہوجائے گی، ہم مسلمان اپنے جس برادر وطن کو

اپنا سب سے بڑا مخالف سمجھیں اس سے محبت انگیز انداز میں ملیں، اس کی غلط فہمیاں از خود دور اور کافور ہو جائیں گی، اور اپنے مدمقابل کو یہ باور کرائیں کہ ہم اس کے حریف نہیں بلکہ حلیف ہیں اور اپنے ہیں، یہ باہمی ربط وارتباط رقابتوں اور عداوتوں کو دور کر کے محبتوں کی نعمتوں سے ہمکنار کرے گا، سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر بارش کے چھینٹوں سے مردہ زمین میں زندگی آسکتی ہے تو کیا محبت کے چھینٹوں سے مردہ دلوں کو ازسرنو زندگی نہ ملے اور ہماری ماسیوں کو امید بھری روشنیاں نہ فراہم ہوں۔

اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے:"ادفع بالتی ھی احسن فاذ الذی بینك و بینه عداوة کانه ولی حمیم "اے نبی! تم بدی کو ایسی نیکی کے ذریعہ دفع کرو جو بہترین ہو، تم دیکھو گے کہ وہ جس کی تمہارے ساتھ عداوت تھی وہ جگری دوست بن گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی دنیائے انسانیت کے لئے عموما اور اہل اسلام کے لئے خصوصا ایک آئیڈیل اور نمونہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر مسلموں سے بہت اعلی اور مستحکم قسم کے تعلقات تھے، ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک سے اس موضوع سے متعلق نمونہ پیش کر رہے ہیں۔

جب آپ صلی اللہ علیہ پر پہلی وحی کا نزول ہوا تو چونکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کا یہ پہلا سابقہ تھا اس لئے آپ ایک قسم کی گھبراہٹ اور اضطراب میں مبتلا ہو گئے، ڈرے سہمے گھر واپس آئے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جو تسلی آمیز کلمات ارشاد فرمائے، وہ قابل غور وتوجہ ہیں۔

حضرت خدیجہ نے عرض کیا:" کلا و الله لا یخزیك الله ابدا، انك لتصل الرحم، و تحمل الکل و تکسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق"۔

واللہ! خدا آپ کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا کیوں کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، آپ مجبوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، آپ بے روزگاروں کے لئے روزگار فراہم کرتے ہیں، مہمانوں کے ضیافت کرتے ہیں، آپ مصیبت زدہ لوگوں کی اعانت کرتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ بالا صفات آپ کی شب وروز کی دمساز وہمراز بیوی بیان کر رہی ہیں، ظاہر ہے یہ سلوک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کے ساتھ برتا تھا جس کا تذکرہ حضرت خدیجہ نے برملا کر دیا، یہ اخلاق تو نبوت سے پہلے کے بیان کئے گئے۔

دوسری مثال نبوت کے بعد کی ملاحظہ فرمائی جائے: اعلا کلمۃ اللہ کے لئے تیرہ سالہ مکی زندگی میں آپ کی تگ ودو اور جہد مسلسل کے باوجود مکہ کی سرزمین مشرکین مکہ نے آپ پر تنگ کر دی تو اللہ تعالی نے ہجرت مدینہ کا حکم دیا، ہجرت میں نکلنے سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو بلا کر وصیت فرمائی، ہم مدینہ جا رہے ہیں تم صبح کو کفار ومشرکین کی یہ امانتیں ان کے حوالے کر کے مدینہ چلے آنا۔

ظاہر ہے یہ امانتیں اہل ایمان اور آپ کے اصحاب کرام کی نہیں تھیں، یہ تو ان لوگوں کی امانتیں تھیں جو آپ کے راستے میں کانٹے بچھایا کرتے تھے، جو آپ کو ممکنہ ایذارسانی میں ذرا بھی تامل اور دریغ نہ کرتے تھے، یہ امانتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جادوگر، شاعر اور کاہن کہنے والے مخالفین کی تھیں، تمامتر دینی مخالفت کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور حسن سیرت پر کتنا اعتماد ان مخالفین کو تھا کہ ایک طرف تو جان سے ماردینے کا فیصلہ کرتے ہیں اور اسی کے پاس اپنی امانتیں بھی رکھ چھوڑی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلی اخلاق کی مثالوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھری ہوئی نظر آئے گی، یہ دو مثالیں تو نمونہ پیش کر دی گئی ہیں، اگر ہم بھی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اپنائیں تو کیا مجال ہے کہ ہم اپنے مخالف کو دوست کرنے میں کامیاب وبامراد نہ ہوں، اسی لئے یہ عرض کیا گیا ہے کہ کمزوری ہماری ہے، قصور ہمارا ہے کہ ہم نے اپنے نبی کی پیروی یکسر پس پشت ڈال دی ہے، ضرورت ہے کہ ہم اخلاقیات، معاملات اور سماجیات غرض زندگی کے ہر موضوع

پر اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اپنائیں اور فقط نامی مسلمان نہ بنیں۔

برادر ان وطن سے تعلقات کی استواری پر ایک اور سنت نبوی ہماری رہنمائی کر رہی ہے لگے ہاتھوں اسے بھی ملاحظہ فرمالیا جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ ہی قبل کی بات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ ایک یہودی کے ہاتھ گروی رکھ دی اور یہ بات بالکل واضح اور کھلی حقیقت ہے کہ وہ زمانہ تھا جو اسلام اور مسلمانوں کے عروج کا زمانہ ہے، لاکھوں افراد اسلامی پرچم تلے آچکے ہیں، ان میں صاحب ثروت حضرت عثمان بن عفان ہیں، زبردست اور کامیاب ترین تاجر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ہیں، ان جیسے اور بھی بامروت خوشحال اور فارغ البال متعدد صحابہ کرام موجود ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ ابرو کی دیر تھی بغیر زرہ گروی رکھے بھی مالی ضرورت پوری ہونے میں چشم زدن کی بھی تاخیر نہ ہوتی، مگر ایک غیر مسلم سے رابطہ کیوں پیدا کیا جارہا ہے دیگر مصالح کے ساتھ ایک روشن حقیقت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے غیروں سے تعلقات میں استواری اور ہمواری ہونی چاہئے تاکہ اسلامی تعلیمات عملی طور پر کارفرما ہوسکیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کا مطالعہ کرلیا جائے، قبل ازنبوت ہو یا بعد ازنبوت مظلومانہ اور بیکسانہ زندگی ہو یا مقتدرانہ، ازاول تا آخر غیروں سے بھی مخلصانہ، ہمدردانہ اور خوشگوار تعلقات پوری دنیائے انسانیت کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے ایک اسوہ اور نمونہ ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں ! ضرورت اس بات کی ہے کہ تمہاری حکمرانی دلوں پر ہو تو کام بنے گا، اسلامی تعلیمات میں انسانیت کی عظمت اور انسانیت کے احترام کے رہنما خطوط متعین کئے گئے ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کے ملکی وملی مسائل کا صحیح اور درست حل کل بھی اسلامی اقدار روایات کو بحال کر کے ہی ملتا تھا اور آج بھی اسی کی ضرورت ہے۔

آج ہم پھر سے اسلامی تعلیمات کو عملی جامہ پہنائیں گے تو آپسی دوریاں نزدیکیوں میں تبدیل ہونگی، اور یقیناً ہوں گی، تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ سندھ سے جب عرب مسلمان جانے لگے تو وہاں کی رعایا ان مسلمانوں سے اتنی متاثر تھی کہ ان کے جانے پر آبدیدہ ہوگئی، یہ سب اسی وقت ہوگا کہ جب ہم قرآن کو مضبوطی سے تھامیں گے اور قرآن پر عمل بغیر سنت نبوی کو اپنائے نہیں ہوسکتا۔

قرآن پاک کی تعلیمات پر مسلمانوں کے لئے عمل پیرا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم کی بقا کے لئے روح، بلکہ اس سے زیادہ ضروری، کیونکہ روح تو بالآخر ایک نہ ایک دن جسم سے جدا ہوجاتی ہے مگر قرآن مجید اپنے ماننے اور عمل پیرا ہونے والوں سے کبھی جدا نہ ہوگا، قرآن پاک کے اوامر ونواہی کی تعمیل دنیاوی فلاح وبہبود سے ہمکنار کرنے کے ساتھ ساتھ جہان آخرت میں بھی دائمی راحت وسکون سے لطف اندوز ہوتا ہے، اور یہ بات قرآن مجید کی بہت سی آیات اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

ان بشارات کے بعد ضروری ہے کہ ہم اپنا عملی رشتہ قرآن مجید سے استوار کریں اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالیں دنیا کی کوئی بھی طاقت بجز قرآن مجید کے مسلمانوں کو زندہ نہیں رکھ سکتی، مسلمانوں کے تحفظ کی گارنٹی صرف اور صرف وہ اسلامی اخلاق واقدار ہیں جن کی طرف رہنمائی قرآن پاک نے فرمائی ہے: "وانتم الاعلون ان کنتم مومنین" ایک دم صریحی اعلان ہے۔

❁❁❁❁

اطلاع عام

کاغذ کی حد سے بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بعض دوسری مجبوریوں کی وجہ سے ماہنامہ "نقوش اسلام" کے زرتعاون میں اضافہ کرنا پڑ رہا ہے، لہٰذا مارچ ۲۰۱۵ء کے شمارہ سے فی شمارہ 20/روپے اور سالانہ 240/روپے طے کیا گیا ہے، امید ہے کہ قارئین حضرات اس کے مطابق اپنا تعاون ادارہ کو ارسال کریں گے۔ (ادارہ)

غور وفکر

آخر انہیں شرم کیوں نہیں آتی

حمید اللہ قاسمی کبیر نگری

گذشتہ مہینہ روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو کے شمارہ میں ''سپریم کورٹ کو بھی نہیں بخشا'' کے عنوان سے، سادھوی نرنجن جیوتی کے بیان کو درست قرار دیتے ہوئے سابق مرکزی وزیر سوامی چن میانند نے کہا کہ'' حرام زادہ نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے، انہوں نے مزید کہا کہ اگر ہندو متحد ہو کر پھونک مار دیں تو ہندوستان مسلمانوں سے پاک ہو جائے گا'' یہ خبر پڑھ کر بہت حیرت ہوئی اور انتہائی افسوس بھی ہوا کہ آخر مسلمان اپنے ملک میں کونسی برائی کر رہے ہیں، کہ انہیں ایسے گھناؤنے الفاظ سے مخاطب کیا جا رہا ہے، انہیں کس جرم کی سزا سنائی جا رہی ہے، انہیں ہر طرف سے کیوں لعن طعن کیا جا رہا ہے، مزید براں انہیں ملک بدر کرنے کی دھمکی دی جا رہی ہے، ایسا لگتا ہے کہ'' سوامی چن میانند'' کو ہندوستان کی تاریخ معلوم نہیں ہے، یا وہ ہندوستان کے قانون سے واقف نہیں، اور اگر ہندوستان کی تاریخ سے واقف ہوتے تو شاید یہ باتیں ان کی زبان سے ہرگز ہرگز نہ نکلتی، جبکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہندوستان کو آزاد کرانے میں سب سے آگے مسلمان ہی تھے کہ جن کو غیرت وحمیت نے جھنجھوڑ دیا تھا، جرأت وجسارت نے جھنجھوڑ دیا تھا، شجاعت وصداقت نے جھنجھوڑ دیا تھا، عدالت ومساوات نے جھنجھوڑ دیا اور ایسا جھنجھوڑا تھا کہ آج تک دنیا حیران وششدر ہے اور تاریخ حراساں وپریشاں ہے کہ جب پورا ہندوستان فرنگی فسطائی قوت کے سامنے دست سوال دراز کر رہا تھا، تو ایسے وقت میں سب سے پہلے آزادی کا گن مسلمانوں نے گایا تھا، آزادی کا مطالبہ مسلمانوں نے کیا تھا، حریت وآزادی کا پرچم لہرانے کا منصوبہ مسلمانوں نے بنایا تھا، اس سے ایک قدم اور آگے بڑھئے کہ جب لندن میں ڈنکے کی چوٹ پر مولانا محمد علی جوہرؒ نے یہ کہا تھا'' میں غلام ہندوستان میں واپس نہیں جاوں گا، یہاں سے اس وقت جاؤں گا، جب میرے ہاتھ میں ہندوستان کی آزادی کا پروانہ ہوگا اور اگر مجھے آزادی کا پروانہ نہیں دے سکتے ہو، تو میرے لیے اس سرزمین میں ایک قبر کی جگہ تو دینی ہوگی'' یہ تھے مسلمانوں کے جذبات جو اپنے پیارے ملک کے لئے کر رہے تھے، جہاں اپنی جانوں کو بھی قربان کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے تھے، شمیم اکبر آبادی کا یہ شعر بار بار دل ودماغ کو کچوکے لگا رہا ہے:

ہم مسلمان ہیں جاں نثار وطن
ہم نے قائم کیا ہے وفا کا چلن
ہم خلوص ومحبت کے غم خوار ہیں
راہ حق میں صداقت کے سالار ہیں
دشمنوں کے لئے موت کی دھار ہیں
سر پہ رہتا ہے ہر دم ہمارے کفن

غرضیکہ مسلمانوں نے ہر موڑ پر ہندوستان کی مدد کی اور انہی کی قربانیوں سے یہ ملک آزاد ہوا، پھر کیوں انہیں اس ملک میں ستایا اور آزمایا جا رہا ہے، ان کے خون سے ہولی کیوں کھیلی جا رہی ہے، ان کی عزت وناموس پر حملہ کیوں کیا جا رہا ہے، ایسا لگتا ہے کہ اب اس ملک میں دیش بھگتی اور وطن پرستی کے نام لیواؤں کو الٹا انہیں قربانی کا بقرہ بنایا جا رہا ہے، اور حکومت خاموش تماشائی بنی ہوئی دیکھ رہی ہے، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ تاریخ گواہ ہے اور آئین ہند اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ مسلمان اس ملک کا سچا وفادار ہے، یہ مسلمان اپنی جان تو دے سکتا ہے لیکن وطن سے غداری اور منافقت کا کوئی سوال

پیدا نہیں ہوتا، ذیل میں حب الوطنی کے دو واقعہ کو نوک قلم کر رہا ہوں، ملاحظہ فرمائیں:

ہندوستان کی تقسیم کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ مشرقی پنجاب کے کسی ضلع یا تحصیل میں کوئی مسلمان نہیں رہے گا، انہیں اپنا مکان چھوڑ کر مغربی پنجاب (پاکستان) جانا ہوگا، لہٰذا جناب والا بھی لدھیانہ چھوڑ کر پاکستان کے جس شہر میں جانا چاہیں تشریف لے جائیں، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانویؒ میں پنجابی خون تھا، ان کا لباس بھی آخر دم تک پنجابی ہی رہا، آواز کی کڑک بھی بجلی کی طرح تھی، چنانچہ اس نوٹس کو دیکھ کر وہ آگ بگولہ ہوگئے اور سیدھے دہلی کیلئے روانہ ہوگئے، دہلی میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کے پاس پہنچے، انہوں نے احترام کا وہی رویہ اپنایا جو برسوں سے ان کا انداز تھا اور کہا کہ مولانا صاحب حکم فرمائیں کیسے تکلیف فرمائی؟۔

حضرت مولانا نے وہ نوٹس پنڈت جی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے فرمایا کہ اس کا جواب میں تو نہیں دے پاؤں گا، آپ گورنر ''جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن'' کو ایک خط لکھ کر مجھے دیدیجئے کہ میرے اور میرے اہل وعیال کے ویزے لندن کے لئے دیدیں، تاکہ میں باقی عمر پورے برطانیہ میں گھوم گھوم کر انگریزوں سے معافی مانگ کر گزار دوں، ان سے کہوں کہ ہم نے ہندوؤں کو سمجھا نہیں تھا، اس لئے ان کا ساتھ دیا اور آپ سے جنگ کی تھی، آپ ہمیں معاف فرمادیجئے۔

پنڈت جی کا رنگ بھی گورا تھا، اور حضرت مولانا لدھیانویؒ بھی سرخ سفید تھے، ان جملوں کے تبادلہ میں دونوں انگاروں کی طرح سرخ ہوگئے اور پنڈت جی نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ سردار پرتاپ سنگھ کو ٹیلی فون کیا اور کہا کہ ''مولانا اور ان کا خاندان لدھیانہ کے جس محلّہ اور جس مکان میں ہیں، وہیں رہیں گے، ان کے محلّہ کو پولس چھاؤنی بھی اگر بنانا پڑے تو بنادیجئے لیکن مولانا پاکستان نہیں جائیں گے''۔

گویا مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کے رگ وپے میں ہندوستان کی محبت رچی بسی تھی اس لئے وہ پاکستان جانا نہیں چاہتے تھے، ایسے ہی دیش بھگتی اور حب الوطنی میں ایک نمایاں نام خان عبدالغفار خان کا بھی ہے، تقسیم ملک کے خوفناک حوادث کے بعد جب پنجاب کے مسلمان نقل مکانی پر مجبور ہوئے تو آپ کی مرضی کے خلاف آپ کی اہلیہ اور آپ کے بچے بھی پاکستان چلے گئے، لیکن اولاد سے فطری محبت کے باوجود آپ نے نہ صرف پاکستان جانا ناپسند کیا بلکہ وہاں سے آنے والے خطوط کو بھی نہیں پڑھتے تھے، اہلیہ اور بچوں کی جانب سے جو خطوط آئے دن موصول ہوتے تھے، آپ ان کو ڈبوں میں رکھتے جاتے تھے۔

آخری دور میں جب خان صاحب دہلی میں سخت بیمار ہوئے اور ہسپتال میں داخل کئے گئے تو وہ آپ کا آخری وقت تھا، کسی نے اندرا گاندھی کو اطلاع دی کہ خان عبدالغفار خان ہسپتال میں داخل ہیں اور کبھی کبھی روتے بھی ہیں، پنڈت جواہر لعل نہرو سے خان صاحب کے جو تعلقات ومراسم تھے، ان سے اندرا گاندھی بھی خوب واقف تھیں، ایک دن اندرا گاندھی خان صاحب کی عیادت کے لئے ہسپتال آگئیں اور خان عبدالغفار خان سے پوچھا کہ خان صاحب کیا بال بچے یاد آرہے ہیں اور ان کو بلوادیا جائے تو خانصاحب نے جھڑک کر کہا نہیں! اور دوسری طرف منہ پھیر لیا، اندرا گاندھی پلٹ کر دوسری طرف گئیں، تو دیکھا کہ خانصاحب واقعی رو رہے تھے، اندرا گاندھی سمجھ گئیں، آخری وقت ہے، بچے یاد آرہے ہیں، اندرا گاندھی نے اپنے سکریٹری کو طلب کیا اور کہا کہ تم فوراً پاکستان میں ہندوستانی ہائی کمیشنر کو فون کرو اور کہہ دو کہ خان عبدالغفار خان کے بچے جہاں کہیں بھی ہوں وہ تیار ہوکر ایمبسی میں آجائیں اور یہاں سے چارٹرپلین بچوں کو لینے کے لئے بھیجا جارہا ہے، ان کو فوری طور پر ہندوستان لانا ہے، جب بچے چارٹرپلین سے ہندوستان آگئے تو اندرا گاندھی خان عبدالغفار خان کے بچوں شمیم حیدر، عظیم حیدر کو لیکر خان عبدالغفار کے پاس ہسپتال گئیں اور کہا کہ خان صاحب یہ آپ کے بچے ہیں، اسی طرح اندرا گاندھی نے آپ کی آخری تمنا اور خواہش پوری کی۔

❁❁❁❁

فکر و عمل

قرآن کریم

دنیائے انسانیت میں ہمہ جہت انقلاب کا نقیب

مولانا مفتی محمد اللہ خلیلی قاسمی شعبہ انٹرنیٹ دارالعلوم دیوبند

قرآن کریم سے پہلے اور بعد کی عالمی تاریخ کا اگر تقابلی جائزہ لیا جائے تو بہت واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے ذریعہ ہی تاریخ عالم کا سب سے زیادہ صالح انقلاب برپا ہوا ہے، یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں بپا ہونے والا ہر انقلاب قرآنی انقلاب کا براہ راست یا بالواسطہ نتیجہ ہے، نزول قرآن سے پہلے اور بعد کی انسانی دنیا بالکل مختلف ہے، اسلام کے بعد کی دنیا میں انسانی زندگی کا ہر پہلو خوشگوار اسلامی انقلاب کی بادبہاری سے مہک اٹھا ہے، خواہ وہ مذہبی و سیاسی پہلو ہو یا اخلاقی و معاشرتی ہو یا علمی و سائنسی، قرآن کریم نے اپنے بلیغ اور جامع پیرائے میں اس کو "من الظلمات الی النور" (تاریکی سے روشنی کی طرف سے) سے تعبیر کیا ہے۔ (سورۂ بقرہ ۲۵۷، سورۂ مائدۃ ۱۶)

پوری دنیا نزول قرآن سے قبل سماجی سطح پر مختلف ناہمواریوں کا شکار تھی، کہیں نسلی منافرت اور طبقاتی کش مکش جاری تھی تو کہیں مرد و عورت کے تعلق کے درمیان تشدد اور افراط و تفریط پائی جاتی تھی، صنف نازک پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹتے تھے، انسان خود ساختہ غیر متوازن نظاموں میں جکڑا ہوا تھا، ایران والے اپنی قومیت کو عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کا تصور تھا کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر نسل پر انھیں برتری حاصل ہے، یہ اپنے گرد و پیش کی قوموں کو بڑی حقارت و ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کیلئے ایسے نام تجویز کر رکھے تھے جس میں توہین و تمسخر کا پہلو پایا جاتا تھا، یہود خود کو اللہ کی اولاد اور اشرف الناس سمجھتے تھے جب کہ دوسروں کو پیدائشی ذلیل اور حقیر سمجھتے تھے۔

ہندوستان میں بھی طبقہ داری امتیاز عروج پر تھا، ہندی سماج نے باضابطہ "منوشاستر" جیسے قانونچہ مرتب کر رکھا تھا جس کو بہت جلد ملکی قانون اور مذہبی دستاویز کی حیثیت حاصل ہوگئی، منوشاستر کے مطابق برہمن، برہما (خدا) کے سر سے پیدا ہوا تھا؛ اس لیے مذہبی پیشوائی اور رہبری ان کا فرض منصبی تھا، پھر چھتریوں کا درجہ تھا جو برہما کے سینے سے پیدا ہوا اور اس کے ذمہ لڑائی اور دفاع کا کام سپرد ہوا، تیسرے نمبر پر ویش طبقہ تھا اس کا پیشہ زراعت و تجارت تھا اور یہ برہما کے کمر سے پیدا ہوا تھا، سب سے ذلیل شودر تھے جو برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے تھے اور جن کے ذمہ درج بالا تینوں قوموں کی خدمت سپرد ہوئی تھی، منوشاستر میں لکھا ہوا ہے کہ برہمن دنیا کی اعلی ترین مخلوق ہے، ضرورت پڑنے پر اپنے غلام کا مال بہ جبر لے سکتا ہے، یہ اس کے حق میں جرم نہیں، سزائے موت کے عوض برہمن کا صرف سر مونڈا جائے گا اور دوسری ذات کے لوگوں کا سر اڑا دیا جائے گا، کوئی شودر اگر اپنے سے اوپر ذات والوں کے برابر بیٹھ جائے تو اس کی سرین داغ دی جائے گی، کتے، بلی، مینڈک، چھپکلی، کوے اور شودر کے مارنے کا کفارہ برابر ہے۔

خود عرب میں قبائلی اور عائلی تعصب اور جتھ بندی بڑی سخت تھی، اس عصبیت کی وجہ جاہلی مزاج تھا جس کی روح اس مشہور جملے سے ظاہر ہوتی تھی: "انصر اخاك ظالماً او مظلوماً" (اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم) بعض خاندان دوسرے خاندانوں کے ساتھ رسوم و عادات میں شرکت پسند نہیں کرتے تھے، مناسک حج میں قریش عام حجاج سے الگ تھلگ رہتے، ایک طبقہ پیدائشی آقاؤں کا تھا، ایک طبقہ کم

حیثیت لوگوں کا تھا جس سے بیگار لیا جاتا تھا، اس وقت کی سپر پاور طاقت رومن امپائر نے سماج کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا:

(۱) امراء جنھیں بغاوت کے علاوہ کسی جرم میں سزائے موت نہیں دی جاسکتی تھی۔ (۲) متوسط طبقہ جسے غیر معمولی جرم میں سزائے موت دی جاسکتی ہے۔ (۳) نچلا طبقہ جس کے افراد کو معمولی جرائم میں قتل کر دیا جاتا تھا، زندہ آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔

عالمی تاریکی کے اس مہیب ماحول میں مکہ کی سنگلاخ وادیوں سے یہ نوید جانفزا سنائی دی کہ تمام انسان اصل خلقت کے اعتبار سے برابر ہیں، اعلان ہوا کہ سارے انسان اللہ کی مخلوق ہیں، سب ہی ایک درجہ کے ہیں اور کوئی پیدائشی حقیر اور پیدائشی شریف نہیں، ہاں اگر بڑائی اور برتری کا کوئی معیار ہے تو وہ صرف تقوی اور پرہیزگاری ہے: "یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی و جعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم "۔ (سورۃ الحجرات، آیت ۱۳)

اسلام نے ساری انسانیت کی عزت افزائی کی اور بلا تفریق نسل و نسب انسان کو 'مکرمیت' کا تاج عطا کیا، ارشاد ہوا: "ولقد کرمنا بنی آدم "۔ (سورۃ الاسراء، آیت ۷۰)

قرآن کی اس آواز پر عربوں کی موروثی نخوت پارہ پارہ ہوگئی، پھر عرب کے جنگ جو اور اکھڑ مزاج لوگ باہم شیر وشکر کی طرح گھل مل گئے، ان کا سارا نسلی غرور جاتا رہا، آگے چل کر انھوں نے مدینہ منورہ میں تاریخی مواخاۃ (بھائی چارہ) قائم کیا جو انسانی تاریخ کا ایسا نقش جمیل ہے جو رہتی دنیا تک مساوات واخوت کے علمبرداروں کے سنگ میل کی حیثیت رکھے گا، یہی وجہ تھی کہ اسلام کے دوسرے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بلال حبشی کو دیکھتے تو فوراً ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوجاتے اور ان الفاظ میں ان کا استقبال کرتے: ''ہمارے معلم اور ہمارے سردار آگئے'' آج سے چودہ سو سال قبل عرب میں اسلام کی زیر سرپرستی جس عالمی برادری کی تشکیل ہوئی تب سے آج تک ہر دور اور ہر خطے میں اس عالمگیر اخوت اور مساوات انسانی کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، ہزار علم وفن اور تہذیب وتمدن کے بلند بانگ دعووں کے باوجود مغرب نسلی امتیاز اور شراب ختم کرنے میں بری طرح ناکام رہا لیکن اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس نے ایک مختصر مدت میں ان برائیوں کو ہمیشہ کیلئے دفن کر دیا۔

ظہور اسلام سے قبل عورتیں معاشرے میں زبوں حالی کا شکار تھیں، انسانوں کے خود ساختہ اصولوں نے ہمیشہ اس کے ساتھ بے اعتدالیاں برتیں، عرب کے جاہلی معاشرے میں عورت کے ساتھ عمومی بدسلوکی روا رکھی جاتی تھی اور اس کے حقوق پامال کیے جاتے تھے، وہ اقرباء واعزہ کے ترکہ کی حقدار تو کجا، سامان وحیوان کی طرح وراثت میں منتقل ہوتی تھی، ہندوستان میں عورتوں کا برا حال تھا، بیوہ مستحق طعن وتشنیع سمجھی جاتی اور عموماً شوہر کے ساتھ ستی ہونے پر مجبور کی جاتی، یونانی تمدن میں بھی صنف نازک قانونی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی حقوق سے محروم تھی، رومن تہذیب میں عورت زمرۂ انسانیت سے خارج تصور کی جاتی تھی، ان کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا، انگلستان میں کمزور اور بدصورت لڑکیاں سر دار چڑھادی جاتی تھیں، ایران میں عورتوں کو باعث شرم وندامت سمجھا جاتا تھا، الغرض ایک ظالمانہ ماحول تھا، صنف نازک ظلم وستم کے بوجھ تلے کراہ رہی تھی، ہر جگہ اس کے اخلاقی ومعاشرتی حقوق پامال کیے جاتے تھے، ایسے وقت میں اسلام نے انسانیت کے ضمیر کو جھنجھوڑا اور عورتوں کو ان کا فطری اور قدرتی حق دلایا، قرآن کا اعلان ہوا: "عاشروھن بالمعروف "عورتوں کے ساتھ بھلے انداز میں زندگی بسر کرو۔ (سورۃ النساء، آیت ۱۹)

"ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف" اور عورتوں کو معروف طریقہ کے مطابق ویسے ہی حقوق حاصل ہوں گے جیسے مردوں کو ان پر حاصل ہیں۔ (سورۃ البقرۃ، آیت ۲۲۸)

قرآن کی یہی انقلاب انگیز پکار تھی جس نے اقوام عالم کو احساس دلایا کہ کسی مخلوق کے ساتھ ظلم سراسر ناجائز ہے، اسلام کی اسی روشنی میں غیر اسلامی ممالک میں بھی عورتوں کے حقوق نے ترقی کی، مگر صحیح ربانی تعلیمات کے فقدان اور مذہب بیزاری کی وجہ مغربی تہذیب نے اعتدال

کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا، مغرب کے کوتاہ نظر اور فطرت ناآشنا نام نہاد دانشوروں نے عورتوں کو انکے مقام سے زیادہ اوپر اٹھا کر ایک بار پھر انھیں ظلم وستم کا نشانہ بنادیا ہے، مساوات اور آزادئ نسواں کے پردے میں ان کے ساتھ فراڈ کھیلا جارہا ہے، ڈھنڈورا یہ پیٹا کہ عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش لانا ہے، مگر عملاً یہ ہوا کہ انھیں منظر عام پر بازار کا سودا بنادیا گیا۔

پہلے عورت اور مرد کے باہمی رشتے میں بڑی بے ہنگمی تھی، ساری دنیا فطرت کے خلاف افراط وتفریط کے راستے پر گامزن تھی، کوئی مستحکم نظام نہیں تھا جس کی بنیاد پر ازدواجی رشتہ قائم ہو، ایرانی قانون و معاشرت میں ازدواجی تعلقات کیلئے کسی بھی رشتے کا استثناء نہ تھا، ایران کے اس شدید شہوانی رجحان کا ایک غیر فطری اور سخت ردعمل یہ ظاہر ہوا کہ ایک حکم راں مانی نے مرد وعورت کا باہمی اجتماع حرام قرار دے دیا، پھر مزدک نے تمام عورتوں کو تمام مردوں کیلئے حلال کردیا، جس سے پورا ایران جنسی انارکی اور شہوانی بحران میں ڈوب گیا، ہندوستان مذہب و تمدن میں شہوانی جذبات اور جنسی میلان کو ابھارنے والے عناصر چھائے ہوئے تھے، معبودوں کی فہرست میں لنگم اور یونی (مرد اور عورت کی شرم گاہ) بھی اہمیت ساتھ شامل تھے، اس تن پرستی اور نفس پروری کے بالمقابل دوسری طرف نفس کشی اور ریاضت ومجاہدہ (جوگ وتپشیا) کا سلسلہ جاری تھا، خود عرب میں زنا کوئی معیوب بات نہیں تھی اور اس کے بہت سے طریقے رائج تھے، غرض دنیا شہوت وتجرد کے دونوں سروں میں تقسیم اور اعتدال وتوازن سے محروم تھی، کچھ افراد نفس کشی اور روحانی ترقی میں مصروف تھے اور عام آبادی شہوانیت اور نفس پرستی کے دھارے میں بہہ رہی تھی، ایسے ماحول میں اسلام نے انسانی فطرت کے عین مطابق معاشرتی لائحۂ عمل پیش کیا جس میں بھرپور طریقہ پر انسان کے شہوانی جذبات کی رعایت کے ساتھ اخلاقی وسماجی اقدار پیش کیے گئے، اس میں ہر اعتبار سے اعتدال تھا، توازن تھا، جاذبیت تھی اور فطرت انسانی سے مکمل مطابقت۔

اخلاقی انقلاب:

چھٹی صدی عیسوی میں دنیا اخلاقی اعتبار سے کنگال اور دیوالیہ ہوچکی تھیں، انسانیت وشرافت کی بنیادیں ہل چکی تھیں، تہذیب واخلاق ستون اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے، تہذیب وتمدن کے گہواروں میں خودسری، بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دور دورہ تھا، شراب عربوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا، جو جاہلی معاشرے میں بڑائی اور خوبی کی بات تھی، سودی لین دین، کمزوروں کا استحصال اور اس سلسلے میں بے رحمی وسخت گیری عام تھی، بے شرمی وبے حیائی، رہزنی وقزاقی معمولی بات تصور کی جاتی تھی، جنگ جوئی اور سفاکی بائیں ہاتھ کا کھیل بن گیا تھا، بے جا انتقام اور تعصب کا شمار قومی خصوصیتوں میں ہوتا تھا، علامہ قاضی منصور پوری کے الفاظ میں: ''تمام معمورۂ عالم پر سخت تاریکی چھائی ہوئی تھی اور ان ضلالتوں کو دور کرنے میں وہ کتابیں جو دنیا میں نازل ہوچکی تھیں ناکافی ثابت ہوچکی تھیں، اس لیے ضرورت تھی ایسی مہیمن کتاب کی جو تمام عالم کی اصلاح کی طاقت اور تمام کتابوں کو اپنے اندر جمع کرلینے کی قابلیت رکھتی ہو اور بہ لحاظ اپنی مجموعی شان کے دیگر اوراق پریشاں سے مستغنی کردے، جس طرح سخت گرمی کے بعد باران رحمت کا نزول ہوا ہے اور رات کی تاریکی کے بعد آفتاب عالم افروز طلوع ہوتا ہے''۔ (رحمۃ للعالمین)

چنانچہ اسلام نے پوری دنیا کو اخلاق حسنہ کی طرف بلایا، سیکڑوں آیات کے ذریعہ جھوٹ وبہتان طرازی، کبر ونخوت، ظلم وستم، بدسلوکی و بے رحمی، فریب ودھوکہ دہی، شراب نوشی وجوا بازی، زنا کاری وتشدد پرستی، جنگ وجدال اور فتنہ پروری جیسی اخلاقی خرابیوں پر پابندی عائد کی اور انسانوں کو صالح معاشرہ قائم کرنے کی دعوت دی، اس سلسلے میں اسلام کی آواز اتنی مؤثر تھی کہ محض قرآن کے اس اعلان سے کہ شراب گندگی اور شیطانی عمل ہے، مدینہ کی گلیوں میں شراب بہنے لگی، حالانکہ نشہ چھڑانا اور وہ بھی شراب کا کتنا مشکل ہے، آج ساری دنیا اس بارے میں پریشان ہے کہ قوم سے نشے کی لت کیسے ختم کی جائے، اگر قرآن کی ایک پکار نے اسے ایک لمحہ میں ختم کردیا۔

قرآن کی معجزاتی تاثیر نے ہی اخلاق واقدار سے بیگانہ عرب قوم کو تہذیب اور اعلی اخلاق کا آئیڈیل بنادیا، درس گاہ قرآنی کے اولین فضلاء

یعنی صحابہ دین و اخلاق اور سیاست وقوت کے مکمل پیکر تھے، ان میں انسانیت کی اپنے تمام گوشوں، شعبوں اور محاسن کے ساتھ نمود تھی، ان کی اعلیٰ روحانی تربیت، بے مثال اعتدال، غیر معمولی جامعیت اور وسیع عقل کی بنا پر ان کے لیے ممکن ہوا کہ وہ انسانی گروہ کی بہتر طور پر اخلاقی اور روحانی قیادت کرسکیں، ان کے اعلیٰ اخلاقی نمونے معیار کا کام دیتے تھے اور ان کی اخلاقی تعلیمات عام زندگی اور نظام حکومت کے لیے میزان کا درجہ رکھتی تھیں، ان میں فرد و جماعت کا تعلق حیرت انگیز طور پر روادارانہ اور برادرانہ تھا، وہ ایک معیاری دور تھا جس میں عدل وانصاف، صدق و سادگی، خلوص ووفا اور محبت والفت کی خوشگوار ہوائیں چلتی تھیں، اس سے زیادہ ترقی یافتہ دور کا انسان خواب نہیں دیکھ سکتا اور اس سے زیادہ مبارک و پر بہار زمانہ فرض نہیں کیا جاسکتا۔

'تمدن عرب' کا مصنف ڈاکٹر گستاؤلی بان (Gustav Li Bon) لکھتا ہے: قرآن کا اخلاقی نظام نہایت عمدہ ہے، خیرات، نیکی، مہمان نوازی، خواہشوں میں اعتدال، وعدے، سچائی، عاقبت کا خیال، والدین کا اعزاز، یتیم کی کفالت، برائی کے ساتھ پیش آنے والے کے ساتھ احسان اور معاملات میں احتیاط وتورع وغیرہ اس سے بہتر دستور العمل انسان کو نیکی کی طرف راغب کرنے والا نہیں ہوسکتا۔

تعمیری انقلاب:

قرآن نے انسانیت کے بے جان لاشہ میں حرکت واضطراب اور جہد وعمل کی خوشگوار روح پھونک دی، جس سے انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں میں زندگی کی توانائیاں دوڑ گئیں، قرآن نے مردم سازی کی بے نظیر تاریخ پیش کی ہے، اس نے غلاموں کو شہنشاہ، وحشیوں کو اعلیٰ ترین تمدن وتہذیب کا علم بردار بنا دیا، عربوں میں بہت سی ایسی قابل قدر صفات موجود تھیں جن کا وہ صحیح استعمال نہیں کرتے تھے، وہ جنگجو واقع ہوئے تھے، ان کی صحرائی اور غیر تمدنی زندگی کا تقاضہ بھی یہی تھا، جنگ ان کے لیے ایک ضرورت سے زیادہ تفریح اور دل بستگی کا سامان تھی، بہادری ان کے محل سرا کی کنیز تھی، وہ نہایت حق گو، بیباک، فیاض، تیز فہم اور عہد کے پکے تھے، مگر ان کے یہ اوصاف حمیدہ غلط رخ پر محو سفر تھے، ان کی زندگی کا کوئی مقصد اور مطمح نظر نہ تھا۔

قرآن نے آکر ان کی خرابیوں کو اچھائیوں سے بدل دیا اور اچھی صفات کو صحیح سمت پر ڈال دیا، وہ جنگ کا صحیح استعمال نہیں کرتے تھے، قبیلہ اور وطن کے نام پر لڑتے تھے، اسلام نے انھیں اعلاء کلمۃ اللہ اور اشاعت عدل کے جذبہ سے لڑنے کا سبق دیا، اسلام نے اس طرح ان کو متحرک کیا کہ وہ دنیا کے اندھیروں کو ختم کرنے والے اور ہر طرف اجالا پھیلانے والے بن گئے، ان سے لوگوں کو رہ نمائی ملی، یہ اسلامی انقلاب کا تعمیری مرحلہ تھا، عربوں نے قرآن پڑھ کر اس میں عظیم ترین سچائی کو پالیا، قرآن نے ان کے سامنے اعلیٰ مقصد آخرت کو پیش کیا، چنانچہ وہ ان کے لیے حقیقت اعلیٰ کی دریافت کا ذریعہ بن گیا، قرآن نے ان کے ذہن کے بند دروازوں کو کھول دیا، ان کے سینوں میں حوصلوں کے چشمے جاری کردیئے، قرآن نے ان کی سوچ کی سطح کو بدل دیا اور اسی کے ساتھ کردار وعمل کے معیار کو بھی اونچا کردیا، اہل ایمان کو قرآن کا عطا کردہ مقصد حیات اتنا عظیم تھا کہ اس کی حد کہیں ختم نہیں ہوئی، اس لیے ان کی ذات سے ایسے کارنامے ظاہر ہوئے جو کسی حد پر بھی رکنا نہیں جانتے تھے، قرآن نے ان کے ذہن کو جگا کر اس کے اندر سوچ کی بے پناہ محبت بھردی یہی وجہ تھی کہ مشہور مستشرق عالم فلپ کے حتی نے اعتراف کیا: ''عربوں کا ہر شخص ہیرو بن گیا، حتی کہ نزول قرآن کی زمین کا یہ حال ہوا کہ گویا وہ ہیروؤں کی نرسری بن گئی، ایسے ہیرو جن کی صفات اور تعداد کہیں ملنی مشکل ہے''۔ (تاریخ عرب، ص۱۴۲)

سیاسی انقلاب:

نزول قرآن سے قبل دنیا سیاسی اتھل پتھل اور بے راہ روی کا شکار تھی، خاندانی، شخصی اور آمرانہ حکومتوں کا دور تھا، بادشاہ اور حکمراں معبود یا کم از کم معصوم تصور کیے جاتے تھے، ان کا ہر حکم قانون اور وہ قانون سے بالاتر ہوا کرتے تھے، رعایا حکمرانوں کے غلام اور حکمراں ان کے سیاہ و سفید کے مالک ہوا کرتے تھے، بادشاہ کے ایک اشارہ پر کسی رعیت کی

جان لی جاسکتی تھی، اس کے لیے کوئی قانون اور ضابطہ نہیں تھا، اس وقت کے انسان کے پیروں میں خود انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔

قرآن نے خلافت ارضی کے استحقاق کا معیار تقوی اور اتباع حق متعین کیا، شاہی اجارہ داری کا خاتمہ کردیا اور حقیقی جمہوریت کی داغ بیل ڈال کر اس کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کردیا، یہی وجہ تھی کہ خلفائے راشدین شرافت نسبی کے بالاتر ہوکر تقوی، دانائی اور شجاعت کے معیار پر چنے گئے اور رعایا کو یکساں حقوق و مراعات دی گئیں، خلافت راشدہ کا دور زریں مساوات، عدل و انصاف، اظہار رائے کی آزادی وغیرہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

اسی طرح اسلام نے ملکی نظام کے لیے قصاص، حدود اور سزاؤں کا ایسا جامع اور پر اثر قانون پیش کیا جس سے بہتر قانون وضع کرنا ممکن ہی نہیں، یہ اسلامی قانون جہاں نہایت وسیع اور جامع ہے وہیں انتہائی لچک دار اور ترقی پذیر بھی ہے، نبوی زمانہ اور خلافت راشدہ اس اسلامی قانون کا سب سے زریں اور معیاری زمانہ گزرا ہے، اسلام نے انسانی دماغوں کے بنائے ہوئے نظام کے بالمقابل خدائی نظام پیش کیا، اس خدا کا نظام جو انسان کا خالق ہے اور انسان کی ساری ضروریات اور اس کے نفع و نقصان کا بہ خوبی علم رکھتا ہے، اسلامی نظام کی یہی خوبی تھی کہ دنیا کا ابدی اور سرمدی نظام بن گیا۔

اسلامی قانون کی رو سے اقتدار اعلی صرف اللہ تعالی کے پاس ہے، حاکم دراصل صرف اسی کی ذات ہے، دنیا میں جو بھی ہیں سب محکوم ہیں، خود حکمراں صرف خدائی قانون کی قوت تنفیذی ہے بس، اسلامی قانون کی نگاہ میں وہ بھی ایک عام مسلمان کا درجہ رکھتا ہے، انسانی دماغوں کی بنائے ہوئے قانونوں میں کہیں انسانی فطرت سے بغاوت کی گئی اور کہیں حدود سے تجاوز کیا گیا، نتیجتاً موقع بہ موقع تضادات پیدا ہوئے، تصادم کی نوبت آئی اور بالآخر ایک نظام کی جگہ دوسرے نظام نے لی اور ایک قانون کو توڑ کر دوسرا قانون مرتب ہوا، اس طرح انسان خود ساختہ قوانین کی چکی میں پستا رہا۔

قرآنی نظام حکومت جہاں نافذ ہوا وہاں امن و امان اور خیر و صلاح کا دور دورہ رہا اور فتنہ و فساد ناپید رہا، تاریخ کے اس دور میں جب اسلامی نظام ایک غالب نظام کی حیثیت رکھتا تھا، کہیں بھی انسانیت کو کسی قسم کا شدید ترین بحران نہیں لاحق ہوا، وہ خواہ اخلاق و معاشرت کا معاملہ ہو، یا حقوق و معاملات ہوں یا سیاست اور ملک رانی کا معاملہ ہو، کسی بھی سطح پر دنیا کو کسی عظیم بحران نہیں پیش آیا۔

لیکن گزشتہ چند سو سال کے اندر جب سے مغرب کا سیاسی نظام دنیا پر مسلط ہوا ہے دنیا کو صرف گذشتہ صدی میں عالمگیریت اور ملک گیری کی ہوس میں کم از کم دو عالمی جنگوں کا منھ دیکھنا پڑا ہے، جس کے نتیجہ میں روئے زمین کی سب سے بڑی تباہی اور قتل و غارت گری پیش آئی محتاط اندازے کے مطابق آٹھ کروڑ انسانوں کی جانیں گئیں، اس کے علاوہ دیگر جنگوں اور آتش و بارود کی کھیل میں کتنی انسانی جانوں کا ضیاع ہوا وہ اس شمار سے باہر ہے، مغرب کی اسی ملک گیری اور استعماریت کی ہوس کی وجہ سے ملکوں میں بے حد و حساب اسلحہ اور جنگی ساز و سامان کو بنانے اور جمع کرنے کی دوڑ شروع ہوئی جو اس حد تک پہنچ گئی ہے، سچ مچ دنیا بارود کے ڈھیر پر کھڑی ہوئی ہے، انسان نے انسان کو مارنے کے لیے روئے زمین پر اتنے مہلک ہتھیار جمع کر لیے ہیں کہ وہ اس جیسی ہری بھری اور آباد دنیا کو کئی بار تباہ و برباد کرنے کے لیے کافی ہیں۔

مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام نے دولت کا توازن ختم کردیا ہے، اسلامی نظام میں معاشرے میں دولت کی گردش بیع و شراء اور جائز تبادلہ پر مبنی تھی، لیکن مغرب کے مالی نظام کی بنیاد سود ٹھہرایا گیا جو انسانی تاریخ کے ہر دور میں غریبوں کا خون چوسنے اور کمزور کو مزید کمزور اور دست نگر رکھنے کا ذریعہ رہا ہے، آج اسی نظام کا نتیجہ ہے کہ دولت چند ہاتھوں کی باندی بنی ہوئی ہے اور وہ جس طرف چاہتے ہیں دنیا کے مالی نظام کو گھما پھرا رہے ہیں، آج جو مالدار ہے وہ مزید مالدار ہو رہا ہے اور غریب شخص غربت کے دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔

وہ قرآن ہی کی طاقت تھی کہ جس کی بدولت مسلمانوں نے ایسی دنیا فتح کی جو سکندر اعظم کی حکومت سے زیادہ وسیع تھی اور وہ بھی چند دہائیوں میں جس کو پورا کرنے میں سکندر اعظم کو کئی سو سال لگ گئے، قرآنی تعلیمات میں اتنی تاثیر اور بلا کی قوت تھی کہ مسلمانوں کی فتح کا جھنڈا جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر صحرائے افریقہ اور یورپ تک اور مشرق میں آخری حدود تک لہرا گیا، افریقہ کے وہ ممالک جو قبطی بولتے تھے اور غیر عربی طرز حیات کے حامی تھے، ان کی زبان عربی ہوگئی اور رسم و رواج اسلامی بن گیا۔

یہ اسلام کا سیاسی انقلاب ہی تھا کہ دنیا کو ایسا سیاسی نظام میسر ہوا جس کی روح عدل و مساوات، امن و رواداری، جمہوریت اور حقوق برآری تھی، اس نظام کی برکت سے دنیا کا سیاسی نظام ایک ایسے دور میں داخل ہوا جہاں معاشرے میں ہر فرد کو آزادی حاصل تھی، مظلوم کو انصاف ملتا تھا، کمزور کو تحفظ ملتا تھا، جمہوریت اور آزادی جس سے مغرب ابھی چند صدیوں قبل آشنا ہوا ہے وہ دراصل اسلام کے اسی صالح سیاسی انقلاب چربہ ہے جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے دنیا میں برپا ہوا اور ہزار سال سے زیادہ دنیا کے ایک بڑے حصے پر قائم و دائم رہا۔

علمی انقلاب:

فاران کی چوٹیوں پر آفتاب اسلامی کی جلوہ افروز ہونے سے پہلے ربع مسکوں پر ہالت کی حکم رانی تھی، ساری دنیا علم کے نام سے ناآشنا تھی، یورپ ازمنۂ وسطی میں خواب غفلت کے مزے لے رہا تھا، وہاں ہر طرف جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، چرچ کے غلبہ اور اس کے مظالم کی وجہ سے ہر قسم کی ترقی رکی ہوئی تھی، علم و ہنر اور سائنس و فلسفہ کی تحصیل جرم تھی، ذہنی ترقی کرنے والوں کو مبتلائے عذاب کیا جاتا تھا۔

خود عرب جہالت میں دوسرے اقوام عالم سے کچھ کم نہ تھے، وہاں جہالت کوئی عیب ہیں بلکہ قابل فخر سرمایہ تھی:

الا لا یجھلن احد علینا ☆ فنحن فوق جھل جاھلین

ان کا قومی نعرہ تھا، پورے جزیرۃ العرب میں بہ مشکل پڑھے لکھے اشخاص ملتے تھے، قبیلہ قریش جو تمام عرب قبائل میں سے مہذب اور پیشوا تھا، اس میں اس وقت صرف سترہ اٹھارہ افراد لکھ پڑھ سکتے تھے۔ (الفاروق بحوالہ فتوح البلدان للبلاذری)

ایشیا کے دیگر مشرقی خطے بھی ناخواندگی کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے، گویا سارے عالم پر جہالت و لاعلمی کے بادل منڈلا رہے تھے، شرک والحاد کی گھنگھور گھٹاؤں میں جہالت و ناخواندگی کی بجلیاں کوند رہی تھیں، اس گھٹے ہوئے ماحول میں سب سے پہلے جس نے علم روح پرور اور بہار آفریں آواز بلند کی ہے وہ قرآن ہے، اس نے آواز لگائی: "اقرأ باسم ربك الذی خلق، خلق الانسان من علق ، اقرأ و ربك الاکرم"۔ (سورۃ العلق، آیت ۳-۱)

"قل ھل یستوی الذین یعلمون و الذین لا یعلمون"۔ (سورۃ الزمر، آیت ۹)

"والذین اوتوا العلم درجات"۔ (سورۃ المجادلۃ، آیت ۱۱)

قرآن میں علم کے سلسلے میں مختلف پیرائے میں درجنوں آیات نازل ہوئیں اور علم کی اہمیت بیان کی گئی، چناں چہ دنیا نے دیکھا کہ جہالت پر فخر کرنے والوں میں علم و فکر کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے اس علم کی روشنی کو ساری دنیا میں پھیلا دیا، قرآن کے علمی انقلاب کی بدولت انسان کی خوابیدہ صلاحیتیں ابھرنے لگیں اور ذوق آگہی زندگی کی توانائیوں سے محظوظ ہونے لگا، جزیرۃ العرب جو کبھی غیر متمدن اقوام کا مرکز تھا، علم و ادب اور فکر و فن کا گہوارہ بن گیا، اسلامی مملکت کے مکہ و مدینہ، شام و بغداد، کوفہ و بصرہ، قرطبہ و قاہرہ اور وسط ایشیا ہفت افلاک کی بلندیوں پر کمندیں ڈالنے لگے، مشینی اعتبار سے اس ناترقی یافتہ دور میں طباعتی سہولیات وغیرہ کی عدم موجودگی کے باوجود معمولی سی معمولی جگہوں پر لاکھوں کتابوں کے علمی ذخیرے ہوتے تھے جو سب کی سب مخطوطہ یعنی ہاتھ کی لکھی ہوتی تھیں۔

یہ قرآن ہی کی برکت تھی جس نے عربوں میں ایسا ذوق آگہی پیدا کیا، پھر عرب سے ہی سے علم کی خوشبو پھیلی اور پھر ساری دنیا کے مشام

جان معطر ہوتے گئے، گڑبڑٹ نے لکھا ہے: عربوں کے علمی و دماغی تسلط نے یورپ کے لیے علوم وفنون کا دروازہ کھول دیا اور چھ صدی تک عرب ہمارے استاذ اور تمدن سکھلانے والے رہے، ایک دوسرے مستشرق نے لکھا ہے: جب یورپ دور جہالت میں تاریکی کے گڈھے پر پڑا ہوا تھا، اس وقت خلفائے بغداد وقرطبہ اسلامی ممالک میں تہذیب وتمدن کی روشنی پھیلا چکے تھے اور جب کہ یورپ کے روساء وامراء اپنا نام لکھنا بھی نہیں جانتے تھے، اس وقت اسلامی ممالک میں ہر لڑکا اور لڑکی آسانی سے لکھ پڑھ لیتے تھے، فان کریمر نے لکھا ہے کہ تہذیب وتمدن کو ترقی دینے میں عربوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس کے لیے یورپ ان کا جتنا احسان مند ہو تھوڑا ہے، بلکہ وہ اس احسان سے سبک دوش ہی نہیں ہوسکتا۔

عربوں میں علم کا ذوق قرآن نے پیدا کیا، قرآن کی دعوت تعلیم نے اولاً عربوں کو مسخر کیا، پھر ان کے توسط سے ساری دنیا میں تعلیم کی ہوا چلادی، آج دنیا میں زندگی کے بعد جو چیز سب سے اہم ہے وہ قرآن کی عطا کردہ 'تعلیم' ہے۔

فکری و سائنسی انقلاب:

نزول قرآن سے پہلے انسان پر فکری جمود طاری تھا، ذہنیت عام طور پر بہت محدود اور کوتاہ تھی، انسان اپنی حیثیت سے بے بہرہ اور غافل تھا، اس نے پتھروں، بھوت پریت اور درختوں بلکہ ہر تعجب خیز اور ندرت آمیز چیز کو پوجنا شروع کردیا تھا، مظاہر قدرت کو عقیدت و پرستش کی نظر سے دیکھنا ایک عالمی نظریہ تھا، انسان کا خود ساختہ عقیدہ تھا کہ کائنات کی کسی چیز کی تحقیق باعث ہلاکت ہے، یورپ اس وقت تاریخ کے اندھیروں میں سے گذر رہا تھا، یونان وروم کی ترقی کے باوجود اہل یورپ کی ذہنی وفکری سطح نہایت پست اور غیر ترقی پذیر تھی، یورپ میں کوپرنیکس نے جب زمین کی گردش اور آسمان کا سکوت ثابت کیا تو ذلت وخواری کے ساتھ اس کا خاتمہ کردیا گیا، برونو کو ذہنی ترقی کی وجہ سے دھیمی آگ میں جلا کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

خود عرب فکری وذہنی اعتبار سے نہایت تنگ تھے، ان کے خیالات کی پرواز حسن میں عورت، بلندی میں آسمان اور وسعت میں صحرا و بیابان کے مورانہ تھی، کائنات کی وسعتوں اور اس کے مناظر سے سبق لینے اور اس میں غور وفکر کرکے استفادہ کے بجائے وہ اس کی تعظیم و پرستش کے درپے تھی، وہ انسان کی اشرفیت و افضلیت سے ناواقف تھے، چنانچہ قرآن نے ان کو ان کی اہمیت یاد دلائی: ولقد کرمنا بنی آدم (سورۃ الاسراء، آیت ۷۰) لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (سورۃ التین، آیت ۵) اور سیکڑوں آیات کے ذریعہ کائنات کے مناظر ومظاہر کی طرف متوجہ کیا اور خلق السماوات والارض میں 'تفکر' کی دعوت دی:

"اِنَّ فِیْ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِلْمُؤْمِنِیْنَ، وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِقَوْمٍ یُوْقِنُوْنَ، وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیَاحِ اٰیٰتٌ لِقَوْمٍ یَعْقِلُوْنَ"۔ (سورۃ الجاثیۃ 5-3)

اسلام نے مسلمانوں کو چار بنیادی فرائض کا مکلّف بنایا یعنی نماز، روزہ، زکاۃ اور حج، چناں چہ ان احکام نے بالواسطہ اہل اسلام کو تحقیق و تدقیق پر آمادہ کیا کیوں کہ نماز کا تعلق علم فلکیات اور جغرافیہ سے ہے کیوں کہ اوقات صلاۃ کی تعیین میں طلوع وغروب وغیرہ کا اور قبلہ کی سمت کے تعین کے لیے جغرافیہ کا جاننا لازمی ہے، اسی طرح روزہ کا تعلق فلکیات اور ریاضی سے ہے؛ کیوں کہ قمری مہینوں کی ابتداء وانتہاء وغیرہ کا تعلق فلکیات اور کیلنڈر سے ہے، زکاۃ کا تعلق علم الحساب (ریاضی) سے ہے اور حج کا جغرافیہ سے، وغیرہ۔

قرآن کی دعوت تفکر وتحقیق کے نتیجے میں عربوں کے دماغوں کی کنجی کھل گئی، وہ جس کو دیوتا سمجھ بیٹھے تھے اسلام نے اسے انسانوں کا خادم اور قابل تسخیر بنادیا" خلق لکم ما فی الارض جمیعاً" پھر کیا تھا مسلمانوں میں ایک صدی کے اندر ہی علم فلسفہ، سائنس، طب، علم الادویہ، علم حفظان صحت، علم جراحی، علم نباتات، جغرافیہ، کیمیا، ہیئت و فلکیات اور زراعت وغیرہ کی بنیاد پڑ گئی اور آگے چل کر وہ ساری دنیا کے

امام بن گئے 'تمدن عرب' کے مصنف کستاؤلی بان نے لکھا ہے: عربوں نے تجربہ ومشاہدہ پر مبنی تحقیق کو رواج دیا، تحقیقات علمی کے لیے تجرباتی طریقے کو کچھ لوگ راج بیکن کی طرف منسوب کرتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے موجد عرب تھے، ڈریپر کہتا ہے: عربوں کی عقل سلیم نے انھیں یہ بات سمجھادی تھی کہ سائنسی ترقی یہ محض تخیل سے نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کا صحیح اور یقینی ذریعہ فطرت کا مطالعہ ہے، ان کے علم کی بنیاد تجربے اور مشاہدے پر تھی۔

ہیئت ان علوم میں سے ہے جس میں مسلمانوں نے صدیوں پہلے جو تحقیقات کرلی تھیں اس سے یورپ آج تک مستفیض ہورہا ہے، مسلمانوں نے اپنے رصد خانوں میں ستاروں کی شناخت کر کے درجہ بندی کر رکھی تھی، نظام شمسی اور اجرام سماوی کے متعلق انکشافات کیے تھے، انھوں نے زمین کی وسعت، اختلاف حرکت قمر اور نقطہائے معتدل النہار دریافت کیے، ابن رشد نے آسمان کے نقطۂ اوج، ابوالحسن نے ہواء انعکاس کا انکشاف کیا، المامون نے مدار شمس کی کج روی کا پتہ لگایا، ابن یونس، نصیرالدین طوسی اور بستانی کی کتابوں کے مغربی زبانوں میں ترجمے ہوئے، ان کی کتابیں صدیوں تک یورپ کے نصاب تعلیم کا جز رہیں، وہ پہلے پہل مسلمان تھے جنھوں نے یورپ میں رصدگاہیں تعمیر کیں، دوربین، قطب نما، ساہول اور دیگر آلات اختر شناسی ایجاد کئے۔

دنیا آج بھی طب میں رازی و ابن سینا، جراحی و سرجری میں ابوالقاسم زہراوی، علم کیمیا میں جابر بن حیان، بصریات میں ابن ہیثم، فلسفہ میں فارابی، ابن رشد اور غزالی، ریاضی میں خوارزمی اور دیگر سیکڑوں مسلم سائنس دانوں اور ماہرین کے علمی احسانات کے تلے دبی ہوئی ہے، مغرب کو علوم جدیدہ کی یہ روشنی مسلمانوں سے ملی جو ازمنۂ وسطی میں یوروپ کی ایک وسیع وعریض خطہ اندلس پر (جس میں اس وقت کا پورا اسپین، پرتگال اور کچھ فرانس شامل ہے) علوم وفنون کی روشنی بکھیرتے رہے، مغرب نے یہ علوم مسلمانوں سے سیکھے اور پھر انھیں آگے بڑھایا۔

دنیا کی انسانی تاریخ میں قرآن سراپا انقلاب ثابت ہوا ہے، قرآن نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں تاریخ ساز تبدیلی پیدا کی، قرآن نے دنیا کے مذہبی وسیاسی، علمی وفکری اور اخلاقی ومعاشرتی حلقوں میں نہایت پاکیزہ اور دوررس انقلاب کی قیادت کی ہے، زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں تک آفتاب قرآنی کی کرنیں نہ پہنچی ہوں، قافلۂ انسانیت، قرآن کی آمد سے پہلے ایک بھیانک اور تباہ کن رخ کی طرف محو سفر تھا، مجموعی طور پر پوری دنیا کی مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور علمی حالت نہایت ابتر تھی، کرۂ ارضی مذہبی بے راہ روی، اخلاقی انارکی، سیاسی پستی، طبقاتی کشمکش، علمی وفکری تنزلی اور معاشرتی لاقانونیت کے اس آخری نقطے پر پہنچ چکا تھا جس کے آگے سراسر ہلاکت، شر وفساد اور ہمہ گیر تباہی کی حکم رانی تھی، قرآن کی دل گیر صداؤں نے اسے ایک روح پرور، حیات بخش اور امن آفریں منزل کی طرف رواں دواں کردیا، قرآن نے دنیا کو اس مہیب صورت حال سے نکال کر سرخ روئی اور سرفرازی عطا کی۔

پوری اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ جب جب مسلمانوں نے خود کو قرآن کی انقلاب آفریں تعلیمات سے مکمل طور ہم آہنگ کیا ہے ان میں انقلابی روح پیدا ہوئی ہے اور ان سے حیرت انگیز انقلابی کارنامے وجود میں آئے ہیں، زوال وادبار کا جو طوفان بلاخیز اس وقت مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے اس کی بنیادی وجہ قرآنی واسلامی تعلیمات سے دوری ہے، کاش یہ حقیقت اعلی ہمیں دریافت ہوجاتی کہ ہماری کامیابی کی کنجی مغرب کی خیرہ کن تہذیب میں نہیں بلکہ سادہ اسلامی تعلیمات میں ہے جس کا سرچشمہ قرآن کریم ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان اللّٰہ یرفع بھذا الکتاب اقواماً و یضع بہ آخرین" اللہ تعالی اس کتاب کے ذریعہ کچھ قوموں کو بلندی عطا کرتے ہیں جب کہ دوسری قوموں کو پستی میں ڈھکیل دیتے ہیں۔ (صحیح مسلم، حدیث ۱۳۵۳)

الغرض قرآن جس طرح کل مسلمانوں کی عظمت ورفعت کا راز تھا، اسی طرح آج بھی وہ مسلم قوم کو ذلت ونکبت کے گڑھے سے نکال کر کامیابی وترقی کی شاہراہ پر گامزن کرسکتا ہے۔ ❁❁

اسوۂ حسنہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بہترین اسوہ ہے

محمد مسعود عزیزی ندوی

یہ مضمون دراصل راقم کا ایک بیان ہے، جو ۴/ مارچ ۲۰۱۱ء جمعہ کے روز مرکز کی جامع مسجد میں نمازیوں کے سامنے ہوا، اس کی افادیت کے پیش نظر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

ہر قوم میں کوئی نہ کوئی ڈرانے والا آیا:

اس دنیا کے اندر اللہ تبارک وتعالی نے پیغمبر بھیجے، نبی بھیجے، رسول بھیجے، جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں اور اپنے اپنے زمانہ میں حالات کے مطابق لوگوں کو تعلیم دی، لوگوں کو ہدایات دیں، اور زندگی گزارنے کا، معاشرہ میں رہنے کا سلیقہ اور طریقہ بتلایا، تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے، سبھی پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانہ کے مطابق اللہ تبارک وتعالی کے احکامات بتلائے "وان من امة الا خلا فیها نذیر" کوئی قوم اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں اللہ کی طرف سے کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہ آیا ہو، ہر زمانہ میں اور ہر جگہ پیغمبر آئے ہیں، جنہوں نے لوگوں کو اللہ کے احکامات بتلائے، ان کو زندگی گزارنے کے سلیقے اور طریقے بتلائے، کسی نے صبر کے سلسلہ میں، کسی نے ایثار کے سلسلہ میں، کسی نے تقوی کے سلسلہ میں اور کسی نے دوسرے سلسلہ میں نمونے پیش کئے۔

آخری نبی کی چارنمایاں صفات:

لیکن آخری پیغمبر جن پر نبوت کی تکمیل ہورہی ہے، جو اللہ کے آخری نبی ہیں، ان کے اندر اللہ تبارک وتعالی نے وہ تمام صفات جمع کردیں تھیں، جو گزشتہ پیغمبروں میں کسی میں ایک، کسی میں دو، کسی میں چند تھیں، چونکہ ان کو ساری کائنات کے انسانوں کے لئے، ساری انسانیت کے لئے نمونہ بنانا تھا، ان کو آئیڈیل (Ideal) بنانا تھا، اور نمونہ اور آئیڈیل وہ ہی بن سکتا ہے جس کے اندر تمام صفات موجود ہوں، چونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پوری انسانیت کے لئے اللہ کے آخری پیغمبر تھے، اس لئے آپ کے اندر اللہ تبارک وتعالی نے چار ایسی صفات رکھی ہیں جو کسی پیغمبر اور دنیا کی کسی بھی بڑی شخصیت کے اندر میں نہیں پائی جاتیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اندر تاریخیت بھی ہے، کاملیت بھی ہے، جامعیت بھی ہے، عملیت بھی ہے، یہ چار صفات دنیا کی بڑی سے بڑی شخصیت، دنیا کے بڑے سے بڑے پیغمبر اور دنیا کے کامل سے کامل انسان کے اندر بھی پوری کی پوری نہیں پائی جاتی ہیں، سوائے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

حضور ﷺ کی زندگی میں تاریخیت بھی ہے:

اس لئے کہ آپ کے اندر تاریخیت ہے، تاریخیت اس اعتبار سے کہ آپ کی زندگی کا، آپ کی حیات کا اور آپ کی سیرت کا ایک ایک عمل تاریخ میں اور سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے، اور وہ سب مستند روایات سے منقول ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو چیزیں وجود پزیر ہوئیں، جس طریقہ سے وہ حادث ہوئیں، جس طریقہ سے وہ واقعہ پیش آئیں، جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ میں وہ جوں کی توں محفوظ ہیں۔

دوسرے مذاہب کی کوئی تاریخ محفوظ نہیں:

دنیا کا قدیم ترین مذہب، برادران وطن کا مذہب ہے، اور ان کو دنیا کی قدیم ترین قوم گردانا اور سمجھا جاتا ہے، ان کے یہاں رامائن اور مہابھارت کے جو ایکٹر ہیں، ان کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں کہ کس دور کے ہیں، کس دور کی کس صدی کے اور کس صدی کے کس سال کے ہیں، تاریخی اعتبار سے اس سلسلہ میں کوئی بھی مضبوط بات محفوظ نہیں،

بڑے سے بڑا مؤرخ نہیں بتلاسکتا کہ یہ کب وجود پزیر ہوئے، کب مہابھارت کا واقعہ پیش آیا، کب رامائن لکھی گئی، کسی کو کچھ معلوم نہیں، حالانکہ ہندوؤں کا یہ سب سے قدیم ترین مذہب ہے اور یہ قوم ہمارے یہاں سب سے قدیم ہے، اسی طریقہ سے گوتم بودھ، جو اپنی قوم کا ہیرو ہے، اپنی قوم کا گرو ہے، اپنے ماننے والوں کا پیشوا ہے، اس کے ماننے والوں کو بھی دنیا میں ایک تعداد موجود ہے، خاص طور سے ایشیاء کا سب سے مشہور مذہب بودھ مت ہے، اور ایشیاء کے اندر سب سے زیادہ اس کے متعین پائے جاتے ہیں، اس کے سلسلہ میں کوئی تاریخ ہم کو نہیں بتلاتی کہ وہ کس زمانہ کا ہے، اندازہ سے لوگوں نے متعین کیا کہ مدلیس کے راجاؤں کا جو زمانہ ہے، اس زمانے میں وہ ہوا ہے، مدلیس کہتے ہیں بہار کو، بہار کی زبان کو اور وہاں کے رہنے والوں کو، اور وہاں کا ایک صوبہ ہے، اس کو مدلیس بولتے ہیں، تو وہاں کے راجاؤں کی جو تاریخ ملتی ہے، اس سے اندازہ کر کے کچھ لوگوں نے متعین کیا، لیکن وہ بھی اندازہ کی حد تک ہے، صحیح تاریخ نہیں معلوم ہوتی، چین کا مشہور مذہب کنفیوشن ہے، اسکے بارے میں بھی کوئی یقینی بات معلوم نہیں ہوتی جبکہ اس کے جاننے والے اور اسکے ماننے والے لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں، مگر تاریخی اعتبار سے اس کی بھی کوئی چیز محفوظ نہیں، صرف دنیا میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی تاریخی شخصیت ہے جس کی ایک ایک ادا، ایک ایک چیز تاریخ میں محفوظ ہے، اس اعتبار سے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کامل، اکمل اور مکمل ہیں۔

حضور ﷺ کی زندگی میں کاملیت بھی ہے:

پھر کاملیت جتنی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پائی جارہی ہے، وہ کہیں اور نہیں، نبی کریم صلی اللہ علی وسلم نے زندگی کے ہر گوشہ سے متعلق اور ہر باب سے متعلق ہدایات دیں، تعلیمات پیش فرمائیں، اور جتنے بھی پیغمبر دنیا کے اندر آئے ہیں ان کی زندگی کے اندر کاملیت نہیں پائی جاتی، بودھ مت اور ہندؤں کی جو رامائن ہے، مہابھارت ہے، اس میں بھی کاملیت نہیں، اسی طریقہ سے مشہور پیغمبروں میں حضرت موسی علیہ السلام ہیں، حضرت عیسی علیہ السلام ہیں، ان کے اندر بھی وہ کاملیت نہیں پائی جاتی ہے، جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہے۔

حضورؐ کی زندگی میں جامعیت بھی ہے اور عملیت بھی:

اسی طریقہ سے جامعیت بھی دوسرے پیغمبروں کی زندگی میں نہیں پائی جاتی، جامعیت بھی ہر اعتبار سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہے، اور چوتھی چیز عملیت ہے، عملیت کے اعتبار سے دنیا کا بڑے سے بڑا فلسفی، دنیا کا بڑے سے بڑا مفکر، دنیا کا بڑے سے بڑا دانشور، دنیا کا بڑے سے بڑا خرد مند اچھے سے اچھے اقوال پیش کرسکتا ہے، اچھی سے اچھی فکر پیش کرسکتا ہے، اچھی سے اچھی باتیں نقل کرسکتا ہے، اور ان کی باتیں اور ان کے اقوال سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہوسکتے ہیں، مگر سو فیصد انکی زندگی میں ان باتوں کا اثر ہو اور ان پر عمل ہو، ان کی زندگی کے اندر بھی وہ باتیں پائی جاتی ہوں، ایسا ممکن نہیں ہے، اقوال اور باتیں ایک سے ایک آدمی بنا سکتا ہے، ایک سے یہ ایک نقل کرسکتا ہے لیکن ان باتوں کا اور ان چیزوں کا جن کا وہ اظہار کرتا ہے، اس کی زندگی میں بھی ان کا نمونہ پایا جائے، ایسا کم ہوتا ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری پیغمبر ایسے ہیں، جن کی زندگی عملیت کا نمونہ ہے، جو باتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائیں وہ آپ کی زندگی میں پوری کی پوری ثابت ہیں اور قرآن کریم اس کی تصدیق کرتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی اور آپ کے کردار کی گواہی دیتا ہے "انك لعلى خلق عظيم" تو آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن کے ہم ماننے والے ہیں، ان کی زندگی ہر اعتبار سے ان چاروں شرطوں کے اعتبار سے، تاریخیت کے اعتبار سے، کاملیت کے اعتبار سے جامعیت کے اعتبار سے اور عملیت کے اعتبار سے محفوظ ہے اور پوری انسانی برادری کے لئے لائق تقلید ہے۔

آپ کی زندگی ہمارے لئے آئیڈیل ہے:

آپ کی زندگی پوری انسانی برادری کیلئے اسوہ ہے، نمونہ ہے،

آئیڈیل ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے جس گوشے کو بھی لے لیجئے، تو آپ کو مکمل اور کامل ہی نظر آئے گا، آج ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ان خصوصیات کو بیان کررہے ہیں، جن خصوصیات کے نمونہ کو پوری انسانی برادری کے اندر پیدا ہونے والی بڑی بڑی شخصیتیں، بڑے بڑے انسان پیش کرنے سے قاصر ہیں، جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے لئے پیش کررہی ہے، اور اس کے متعلق اللہ کا آخری کلام جو معجزہ ہے، جو اللہ کا آخری پیغام ہے، اس کے اندر بھی اللہ تعالی اس کے سلسلہ میں گواہی دے رہا ہے "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" کہ تمہارے لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اندر بہترین نمونہ ہے، آئیڈیل ہے، اور آئیدیل اور نمونہ ہی شخصیت، وہی ہستی ہوسکتی ہے، جس کی زندگی کے تمام گوشے انسانوں کے سامنے اور لوگوں کے سامنے کھلی کتاب کی طرح واضح ہوں، اور یہ امتیاز پوری انسانی تاریخ میں اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، ان کی جو گھریلو زندگی ہے وہ بھی ہمارے سامنے موجود، ان کی اجتماعی زندگی وہ بھی ہمارے سامنے موجود، ان کی انفرادی زندگی وہ بھی ہمارے سامنے موجود، ان کی جنگ وجدال کی زندگی وہ بھی ہمارے سامنے موجود، مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر بیٹھنا وہ بھی ہمارے سامنے موجود، زندگی کا ایک ایک گوشہ وہ ہمارے سامنے موجود ہے، تو ایسا پیغمبر جس کے اندر یہ کاملیت ہو، یہ جامعیت ہو، وہی کامل ہوسکتا ہے، اور وہی اسوہ ہوسکتا ہے، اس کی اتباع کرنا، اس کی پیروی کرنا، اس کی اقتدا کرنا انسان کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

ہر اعتبار سے نبی کی زندگی کی پیروی کریں:

اخلاقی اعتبار سے بھی اس کے لئے اس کی اتباع کرنا ضروری اور اہم ہوتا ہے، اس لئے کہ اتباع اسکی کی جاتی ہے، جو ہر اعتبار سے کامل ہو، تو ہم لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی زندگی ہر اعتبار سے کامل ہے، ان کی زندگی کا اتباع کرنا چاہئے، ہمیں اپنی زندگی کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اعمال کی اتباع کرنے کی کوشش کرنی چاہئے تا کہ تمام باتیں اپنی زندگی کے اندر آجائیں، جب ایک ایک عمل پر کوشش کریں گے، تو ہماری زندگی بنتی چلی جائے گی، سب سے پہلے ہمیں اپنے ایمان کو مکمل کرنا ہے، اور ایمان کو مکمل کرنے کے بعد پھر زندگی کے جو اعمال ہیں، چھوٹے چھوٹے اعمال ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو زندہ کرنا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیسے کھاتے تھے، اس کی نقل کرنی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیسے چلتے تھے، اس کی نقل کرنی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیسے نماز پڑھتے تھے، اس کی نقل کرنی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیسے روزے رکھتے تھے، اس کی نقل کرنی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کے ساتھ کیسے رہتے تھے اس کی نقل کرنی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان والوں کے ساتھ کیسے رہتے تھے، اس کی نقل کرنی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معاشرہ میں کیسے رہتے تھے، لوگوں میں کیسے رہتے تھے، اس کی نقل کرنی ہے، ہر اعتبار سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنی ہے، ایک ایک عمل کو تلاش کرکے، پوچھ پوچھ کر معلوم کرنا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کیسے کرتے تھے، تجارت میں، زراعت میں، اور اپنی انفرادی زندگی میں اور اجتماعی زندگی میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو تلاش کرکے، معلوم کرکے اس پر عمل کرنا ہے، جب اس پر عمل کریں گے تو انشاء اللہ ہماری زندگی بھی کامل ہوجائے گی، اور ایسی زندگی ہوگی جو اللہ کو مطلوب، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلوب، جو ہمارے لئے زندگی صحیح گزارنے کا باعث ہوگی اور ہمیں دنیا کے اندر بھی اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے انعامات ملیں گے، اور آنکھ بند ہونے کے بعد آخرت میں بھی اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے ہم کو انعامات ملیں گے، اللہ تعالی ہمکو صحیح عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام سنتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

❁❁❁❁❁

محبتِ رسولؐ

تحفظ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا مفتی محمد احسان رشیدی جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کسی بھی صاحب ایمان کیلئے ہر شی سے زیادہ محبوب اور ہر رشتہ سے بڑھ کر عزیز ہر سرمایہ سے زیادہ گراں مایہ اور قیمتی ہر قسم کے تعلقات سے زیادہ مرغوب ہے اور کیوں نہ ہو کہ آپ کا تعلق اور محبت اصل ایمان اور روح ایمان ہے، آپ کی عزت وناموس تعظیم وتکریم وجود ایمان کی اساس وبنیاد ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک امتی کا اپنے نبی کے ساتھ رشتہ تمام قسم کے خونی، جانی، مالی، حسی اور نسبی تعلقات سے بڑھ کر ہوتا ہے۔

ہم رات دن مشاہدہ کرتے ہیں کہ کوئی انسان اپنی جان ومال اولاد واقرباء، جاہ ومنصب اور اپنی عزت وناموس کی حفاظت کی خاطر سب کچھ قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا ہے باوجود یکہ یہ چیزیں مادی تعلق کی یک جہتی تصویر ہیں، اب ذرا اندازہ کیجئے کہ جہاں یک جہتی نہیں ہمہ جہتی تعلق ہو جزوی نہیں ہمہ پہلو ہو انفرادی نہیں بلکہ ہر فرد کا اجتماعی تعلق ہو نہ صرف مادی بلکہ روحانی قلبی سب سے بڑھ کر ایمانی عرفانی ہو تو اس تعلق کی حرمت وناموس کے حفاظت کی خاطر ایک صاحب ایمان اپنا سب کچھ لٹانے میں کیسے پیچھے رہ سکتا ہے، اسی لئے دیکھنے میں آتا ہے کہ عام آدمی کی عزت وناموس پر حملہ سے محدود قریبی حلقہ اور فرد خاص ہی متاثر ہوتا ہے جبکہ اللہ کے نبی کی عزت وناموس پر حملے اور شانِ اقدس میں ادنیٰ سی گستاخی اور بے ادبی اور اہانت وتحقیر سے ایک فرد یا چند افراد نہیں بلکہ پورا معاشرہ اور ہر امتی جہاں کہیں بھی رہ رہا ہو وہ متاثر ہوتا ہے، پھر نہ صرف جذبات مجروح ہوتے ہیں بلکہ انتقام کا جذبہ بھی فروغ پاتا ہے، صرف اس لئے کہ یہاں معاملہ دین وایمان کی اساس وبنیاد کے قیام واستحکام کا ہے، ہر کوئی ناموس رسالت کے تحفظ کی خاطر کٹ مرتا ہے، جان ہتھیلی پر رکھ کر گستاخ رسول کو کیفر کردار تک پہنچانے کا نہ صرف عزم بالجزم کرتا ہے بلکہ عملاً ایسا کر کے دکھاتا ہے، اسی جذبہ اور طرز عمل سے ایمان اور دین کی عمارت کا قیام اور دوام ہے یہی شعارِ مسلمانی ہے اس لئے ہر کوئی جانتا ہے: ؎

آبروئے ما زنامِ مصطفیٰ است

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی اور بے ادبی اہانت وتحقیر خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم اشارۃً کرے یا کنایۃً، ارادی طور پر یا غیر ارادی طور پر، بلا واسطہ یا بلواسطہ کسی بھی صورت میں ادنیٰ سی گستاخی وبے ادبی کا مرتکب شخص باتفاق علماء وفقہاء واجب القتل ہے، قرآن وسنت آثارِ صحابہ، اقوالِ ائمہ اس پر شاہد عدل ہیں کہ گستاخِ رسول کی سزا موت بصورت حد ہے حتی کہ اس کو توبہ کا موقعہ بھی نہیں دیا جائے گا، دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی عدالت سربراہِ حکومت قاضی اور حاکم وقت سوئی کے نوک کے برابر بھی اس سزاء میں نہ تبدیلی کر سکتا ہے اور نہ تخفیف وترمیم۔

علامہ ابن تیمیہ سورۂ احزاب کی آیت ۵۸/ سے استدلال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:"ان المسلم یقتل من غیر استتابة وان اظهر التوبة بعد اخذه كما هو مذهب الجمهور"۔(الصارم المسلول ۳۳۷)

کوئی بھی مسلمان جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی وگستاخی کرے گا اسے توبہ کا موقعہ دیئے بغیر قتل کر دیا جائے، اگر چہ وہ بعد الاخذ توبہ کرے یہی مذہب جمہور ہے، نیز حدیث رسول حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ شان رسالتمآب حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں گستاخی وبے ادبی کا ارتکاب کرنے والے کی سزا توبہ کا موقع

دیئے بغیر قتل کرنا ہے:"فانه امر بقتل الذی کذب علیه من غیر استتابه "۔(الصارم المسلول ۳۴۰)۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے طرز عمل اور فکر سے یہی بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ "لما استئاذنه ابو برزه ان یقتل الرجل الذی شتمه من غیر استتابة" جب ابو برزہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ بحیثیت امیر المومنین کی شان میں گستاخی کرنے والے کو توبہ کا موقع دیئے بغیر قتل کی اجازت طلب کی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت اور امتیاز ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کرنے والے کو توبہ کا موقعہ دیئے بغیر قتل کر دیا جائے آپ کے بعد کسی فرد بشر کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ عمر فاروقؓ نے گستاخ رسول کو خود قتل کیا، روایت میں یوں آتا ہے کہ "قتل الذی لم یرض بحکمه من غیر استتابه اصلاً" کہ آپ نے اس شخص کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر راضی نہ ہوا، اس کو توبہ کا موقعہ دئے بغیر قتل کر دیا، باری تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کے اس طرز عمل کی تائید وتصویب میں اس وقت آیاتِ قرانیہ نازل فرما کر تصدیق فرمادی اور حضرت عمرؓ کے اقدام کو درست اور صائب قرار دیا۔(الصارم المسلول ۳۴۰)

امام دارالہجرۃ حضرت امام مالکؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ فتنہ اہانت رسول میں مسلم وغیر مسلم کا امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا دونوں پر حد کا اجرا ہوگا کوئی بھی اس سے مستثنیٰ ومبرا نہ ہوگا، امام مالکؒ نے اس کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:"من سب رسول اللّٰه او شتمه او عابه او تنقصه قتل مسلما کان او کافر ولا یستتاب"۔(الشفاء ۹۳۷/۲)

کہ جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی یا عیب لگایا یا آپ کی تنقیص کی تو وہ قتل کیا جائے گا، خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔

امام احمد ابن حنبلؒ نے فرمایا:"اری ان یقتل ولا یستتاب"۔ (الصارم المسلول ۳۰۰)

کہ میری رائے یہ ہے کہ اسے توبہ کا موقعہ دیئے بغیر قتل کر دیا جائے، امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق سے دو حقوق کا تعلق ہے، ایک اللہ کا حق، دوسرا بندے کا حق ہے اور سزا سے جب اللہ اور بندے دونوں کا حق متعلق ہو جائے تو وہ توبہ سے ساقط نہیں ہوسکتا۔(الصارم المسلول ۳۰۲)

صاحب فتح القدیر علامہ ابن الہمام نے فرمایا کہ جو شخص حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قلبی طور پر بغض وعداوت رکھتا ہے وہ مرتد ہے اور علی الاعلان آپ کو برا کہنے والا کافر ومرتد ہے اسے حداً قتل کر دیا جائے گا اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔(تفسیر مظہری ۳۸۲/۷)

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے ائمہ فقہاء وعلماء کا اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ جس شخص سے شان رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں گستاخی وبے ادبی کی حرکتیں صادر ہوں تو وہ کافر ہو جاتا ہے اسے قتل کرنا واجب ہے ۔(تنقیح الفتاوی الحامدیہ ۱۰۲/۱)

قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ تمام اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ جس شخص نے انبیاء سے کسی نبی کی ہلاکت اور ان کے حق میں کسی مکروہ چیز کی بددعاء کی اسے توبہ کا موقعہ دیئے بغیر قتل کر دیا جائے۔

اصل وجہ کیا ہے کہ توہین رسالت کو کیوں برداشت نہیں کیا جائے گا؟ اور اس مسئلہ میں کسی بھی سطح پر سمجھوتہ سے کام کیوں نہیں لیا جائے گا؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ راوی کی عدالت وثقاہت اگر مجروح ہو جاتی ہے تو روایت کو ناقابل اعتبار قرار دے دیا جاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پورے دین ایمان اسلام تمام عبادات معاملات معاشرہ کیلئے وہ مرکزی محور ہے کہ اگر دشمنان اسلام کی محنتوں اور بے ہودہ کوششوں سے آپ کی ذات گرامی پر کوئی داغ دھبہ آتا ہے تو وہ دین ایمان پر داغ دھبہ ہے، آپ کی ذات مجروح ہوئی تو دین وایمان مجروح ہوتا ہے، آپ کی تنقیص ہوتی ہے تو پورا ذخیرۂ دین ناقص قرار پاتا ہے، اگر آپ انسانوں کے لئے اسوہ اور آئیڈیل نہیں رہتے بلکہ

پروپیگنڈوں کے ذریعہ ناقابل تقلید گردانے جاتے ہیں تو پورے دین وایمان کے مضبوط پہاڑ راکھ کا ڈھیر بن جائیں گے، عربوں کی تعداد میں یہ امت مسلمہ بے دست وپا ہوکر رہ جائے گی، یک لخت سب گمراہ قرار پائیں گے، سارے علمی ذخیرے احادیث مبارکہ تفسیر قرآن کریم حقائق ودقائق معارف اسرار ورموز تصوف وسلوک نظر انداز کردئے جائیں گے، شہداء کی قربانیوں، محدثین ومفسرین، اولیاء واقطاب، مجتہدین کے اجتہادات سب پر پانی پھر جائے گا، اسی لئے یہ معاملہ نہایت حساس قرار پایا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کی اطاعت اپنی اطاعت آپ کی محبت کو اپنی محبت آپ کی دشمنی کو اپنی دشمنی آپ کی مدد کو اپنی مدد آپ کے ادب واحترام کو اپنا ادب واحترام قرار دیا ہے، فرمایا "وما رمیت اذرمیت ولکن اللّٰہ رمی" دست رسول کو دست خدا سے تعبیر فرمایا، کس قدر محبوب ہیں آپ رب العالمین کے فرمایا جو نبی کے ہاتھ پر بیعت کرے وہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے، نیز فرمایا کہ رسول کو اس لئے بھیجا ہے "لتعزروہ وتوقروہ" تاکہ تم خوب تعظیم وتکریم کرو۔ (سورۃ الفتح ۸/۴۸)

دوسری جگہ فرمایا کہ جو لوگ رسول پر ایمان لائے اور ان کی تعظیم کی ان کے دست وبازو بن گئے اور ان کی مدد کی اور اس نور ہدایت قرآن وسنت کی اتباع کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا، یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی مراد کو پہنچے اور کامیاب ہوئے۔ (سورۃ الاعراف ۷/۱۵۷)

قرآن کریم نے یہاں پر جلی الفاظ میں واضح کردیا کہ حقیقی فلاح وکامرانی ان لوگوں کا مقدر ہوگی جنہوں نے اپنے اندر نسبت مصطفوی کو پختہ ومستحکم کرلیا اور آپ کی تعظیم وتکریم اور ادب واحترام کو بجالانے کی صفات کے ساتھ مزین ہوگئے، قرآن کریم کا اسلوب دیکھئے کہ آپ کو شاہد مبشر نذیر مرکز ایمان باعث ایمان الٰہی فرمایا تاکہ یہ بات کالنقش فی الحجر ہوجائے کہ آپ کو اتنی شانوں کے ساتھ اس لئے مبعوث کیا گیا ہے کہ لوگ اتنی ارفع واعلیٰ شانوں اور عظمتوں والے رسول کی تعظیم وتوقیر اطاعت فرمانبرداری کریں۔

یہ مسلمہ اصول ہے کہ تعظیم وتکریم ہمیشہ کسی عظیم المرتبت شخصیت ہی کی کی جاتی ہے، تعظیم معظم کا تقاضا کرتی ہے، گویا یہ فرمایا کہ رسول کی تعظیم وتوقیر کو اپنا وطیرہ حیات بنالو، مفسرین نے تعزروہ کے معنی بیان کئے ہیں تبالغوفی تعظیم علیہ الصلوۃ والسلام کہ اے امت مسلمہ کے افراد کہ تم آقاء دوجہاں کی اس قدر تعظیم وتوقیر بجالاؤ کہ وہ مبالغہ کی حد تک ہو۔

آپ امام الانبیاء خاتم النبیین سید المرسلین ہیں، تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی امت پر لازم تھا کہ آپ اگر ان کے درمیان موجود ہوں تو آپ کی عظمت کو تسلیم کرکے آپ کی اطاعت فرمانبرداری میں اپنی سعادت کو تلاش کریں، لہٰذا جب آپ عام نبیوں کے لئے واجب الاحترام اور لازم الاتباع ہیں تو ان کے ماننے والوں کے لئے بدرجۂ اولیٰ واجب الاحترام ہونگے، آپ کی شان میں گستاخی کرنے والا خواہ یہودی ہو یا نصرانی ہوں سب کے نزدیک ناقابل معافی مجرم بن جائے گا، اگر سیدنا موسیٰؑ، سیدنا عیسیٰؑ دنیا میں تشریف لے آئیں اور وہ آپ کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کرنے والوں کو پائیں تو وہ مبارک ومقدس نفوس بھی گستاخ رسول کو پہلی فرصت میں کیفر کردار تک پہنچا کر نہایت ہی فرحت وسکون محسوس کریں گے، کیونکہ اس میں رضاء خداوندی کا راز مضمر ہے اور کوئی بھی مقرب بارگاہ الٰہی اس موقعہ کو ہاتھ سے گنوانا پسند نہیں کریگا، انبیاءؑ کو تو کیا ادنیٰ سی سمجھ بوجھ قلیل شعور رکھنے والا انسان بھی آپ کی توہین وتحقیر کو برداشت نہیں کرے گا، کیونکہ آپ کی شان میں گستاخی کرنے والا شخص نہایت بد دماغ بدبخت بدنصیب عقل سے کورا بہت بڑا ظالم وجاہل بلکہ بدترین جانور ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانی کمالات وخوبیوں کے مصدر، منبع وسرچشمہ ہیں اعلیٰ انسانی اخلاقی قدروں کو تقسیم کرنے والے بلکہ اعلیٰ انسانی اوصاف وکمالات سے مزین افراد تیار کرنے والے امن وامان، خلوص ومحبت، ہمدردی وخیر خواہی، مروت ورواداری، خدمت ورحم دلی، غمخواری وغمگساری، عدل وانصاف، امانت ودیانت کے سب سے بڑے پیامبر اور علم بردار ہیں، آپ کو کوئی اگر فسادی کی شکل میں پیش

کرنے کی ناپاک ومذموم کوشش کرے تو وہ خود نہایت بڑا فسادی ہے، اور فسادی کی سزا یہ ہے کہ اس کو بہت جلدی سطح زمین سے پاک کیا جائے ورنہ تو فساد بڑھتا ہی چلا جائے گا، اور فساد کسی بھی ملک، کسی بھی خطہ، کسی بھی قوم اور علاقہ کیلئے برداشت نہیں ہے، اس کے خلاف طاقت کا استعمال ناگزیر سمجھا جاتا ہے، کوئی سبزہ زار کو بنجر، مہکتے اور دمکتے پھولوں کے گلشن کو کانٹوں کی سیز خوشبو کو بدبو، روشنی کو اندھیرا، ہمدرد کو ظالم کہنے لگے اس کے عقل پر اولے پڑ گئے اور اس کی باتوں کو ماننے والوں کی عقلوں پر بھی ماتم ہے، اللہ تعالیٰ کی ضد اور عناد سے بد دماغی اور بے عقلی اور اندھے پن سے سارے انسانوں کی حفاظت فرمائے آمین۔

اب ضرورت اس بات کی رہ جاتی ہے کہ جب جب دشمنان اسلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس و پاکیزہ شبیہ کو داغدار کرنے کی کوشش کر رہے ہوں تو تمام تر وسائل وذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے آپ کے کمالات اور اخلاق وعادات کو عالمی سطح پر لوگوں کے سامنے اجاگر کیا جائے، اور آپ کے عالم گیر پیغامات کو ہر ممکن کوشش کے ذریعہ عام انسانوں تک پہنچانے کی سعی بلیغ کی جائے، آپ کے ساتھ سچی محبت وعقیدت کا تقاضا یہی ہے اور عصر حاضر اس بات کا متقاضی ہے کہ شرک کی بات کرنے والوں کے سامنے توحید کے پاکیزہ گلدستے پیش کئے جائیں، توحید کی نافعیت اور افادیت اور ضرورت وحقیقت کو خوب زور دار طریقہ پر پھیلایا جائے، اس سے قبل قائدین ملت اور رہبران شریعت کو بھی معیاری سطح پر بیدار ہونا پڑے گا اور گوشہ نشیں وبوریہ نشیں ہو کر جن صلاحیتوں سے لیس ہوئے ہیں اور جن افکار وجذبات کو اپنے اندر سمویا ہے ان کو اب میدان عمل میں اتر کر ملت کے بکھرتے شیرازے اور گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالنے کیلئے بروئے کار لانا ہوگا، صرف بیانات اور قلم ہی نہیں، بلکہ قدم، حرکت، خدمت اور عمل کو اختیار کرنا ہوگا: ع

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق ومغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

❁❁❁❁

مرثیہ:

بیاد جناب مولانا نیاز احمد ندویؒ

سابق استاد مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور، رائے بریلی

میں کیا بتاؤں نیاز احمد میری نگاہوں میں کیا رہے ہیں
خدا کی مرضی کہ آج مجھ سے بھی منہ چھپائے وہ جا رہے ہیں
سکون غائب، قرار رخصت، ہے چشم پرنم تو غم زدہ دل
کسے بتاؤں بہت کٹھن ہے میرے لئے زندگی کی محفل
نیاز احمد کی موت کیا ہے، فضا پہ بھی چھا گئی اداسی
ہر ایک زباں پر رواں دواں ہے نیاز احمد کی حق شناسی
نیاز احمد ہے سراپا پیام سرکار دو جہاں کے
انہوں نے سامان کر لئے تھے، یقین کامل ہے اس جہاں کے
خدا مغفرت کرے تمہاری، یہی دعائے سحر ہے میری
تمہارا خلد بریں مکاں ہو یہی دعا مختصر ہے میری
خدا ہی صبر جمیل دے گا تمہارے بچوں کو یقین ہے
خدا کی رحمت سے اب بھی غافل تمہارے گھر میں کوئی نہیں ہے
تمہارے بچوں کو یہ دعا ہے سکون وراحت ملے جہاں میں
نیاز احمد نہیں رہے اب، نہ آئے بچو! کبھی گماں میں
دعا ہے بچے تمہاری بیوی جو میری بیٹی ہے کامراں ہوں
نیاز احمد خدا کے گھر میں گل شگفتہ ہوں کامراں ہوں
مجیب آنسو بہا رہا ہے تمہاری اس مرگ ناگہاں پر
اسے جو کرنا ہے کر رہا ہے، حوالے قدرت کے تو وہاں پر

مجیب بستوی
سمریانواں بازار، کبیر نگر (یوپی)

تجزیہ

محبت فاتح عالم

مولانا مفتی رحمت اللہ ندوی نیپالی، استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

''محبت'' کا لفظ نوک زبان یا قلم پر آتے ہی طرح طرح کے عجیب وغریب خیالات وتصورات آنے لگتے ہیں، اور اس کو سنتے ہی حضرت انسان نہ جانے کن کن خیالوں میں الجھنے، بھٹکنے اور سرگرداں رہنے لگتا ہے، اور نہ معلوم کہاں کہاں وہ غلطاں وپیچاں رہتا ہے، اور کس کس سمت افتاں وخیزاں چلتا، رکتا اور ٹھہرتا ہے، دائیں بائیں مڑتا، دیکھتا اور پھر سنبھلتا اور اپنا راستہ لیتا ہے۔

دراصل اس لفظ کے غلط استعمال نے اس کی مٹی پلید کردی اور اسے بدنام وداغدار کرکے رکھ دیا ہے، اس میں جو تعلق، اپنائیت، خلوص، کشش، چاشنی، ایثار وقربانی، ہمدردی وغمگساری اور ایک دوسرے کے کام آنے کا مفہوم پنہاں تھا اور اسی طرح اس میں جو پاکیزگی وشفافیت تھی سب کو ختم کرکے خرد کے دشمنوں کا اور عصر حاضر کے دیوانوں نے ایک دوسرا رخ دیدیا اور عجیب وغریب تصور وتخیل پیدا کردیا، حتی کہ اگر کوئی کسی سے اظہار محبت کرے تو شک کے دائرہ اور شبہ کے ورطہ میں آجاتا ہے، نگاہیں اسے گھورنے اور لوگ اسے ایک مخصوص انداز سے تکنے لگتے ہیں، جبکہ حدیث میں ہے کہ آدمی جب اپنے بھائی سے محبت کرے تو اسے بتادے تاکہ وہ بھی تعلق خاطر رکھے:"إذا أحب الرجل اخاه فلينجره انه يحبه"۔

محبت اپنے پاکیزہ اور شفاف مفہوم میں ایک فطری تقاضا ہے اور اس کائنات کی جملہ مخلوقات حتی کہ چرند، پرند اور درند میں بھی ان کے خالق نے یہ مادہ ودیعت فرمادیا ہے، والدین کو اپنی اولاد، اولاد کو اپنے والدین سے محبت ہوتی ہے، بھائی بہنوں کی آپسی محبت، استاد وشاگرد، چھوٹے بڑے کا تعلق ومحبت اس کا مظہر ہے۔

یہ تھا محبت کا صاف ستھرا مفہوم لیکن جب وہ اپنی پاکیزگی وشفافیت کھودے اور غلط رخ اختیار کرلے تو پھر وہ محبت نہیں رہ جاتی بلکہ کوئی اور شئ کہلاتی ہے، اور ایسا عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی مفاد پر قائم ہو تو جب مفاد ٹکراتا ہے یا پورا ہوتا ہوا نظر نہیں آتا تو یہ محبت عداوت ونفرت میں تبدیل ہوجاتی ہے اور مفاد سے ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتی ہے، اور اس طرح یہ نازک آبگینہ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے: ؎

شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے ❁ دل ٹوٹے آواز نہ آئے

اسی طرح اگر محبت ونفرت اپنے دائرہ میں نہ ہوں تو اس بے اعتدالی وعدم توازن سے بھی بہت سی خرابیاں جنم لیتی ہیں، اس لئے حدیث شریف میں اس کی حد متعین کردی گئی ہے اور اس کا ایک معیار مقرر کردیا گیا ہے، فرمایا:"احبب حبيبك هونا ما عسى أن يكون بغيضك يوماً ما، وابغض بغيضك هونا ما، عسى أن يكون حبيبك يوماً ما" اپنے دوست سے دوستی اور محبت سنبھل کر کرو، ہوسکتا ہے کہ وہ کسی دن تمہارا ناپسندیدہ اور دشمن ہوجائے اور اپنے ناپسندیدہ شخص سے اظہار ناپسندیدگی میں آہستگی اختیار کرو، ممکن ہے کہ کبھی وہ تمہارا محبوب بن جائے، اگر محبت محض اللہ کیلئے ہو جیسے ''الحب اللہ'' کہا جاتا ہے، تو ایسے شخص کو حدیث شریف میں روز قیامت عرش الٰہی کے سایہ کی بشارت دی گئی ہے، جس دن اس کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا "سبعة يظلهم الله في ظله يوم لاظل الا ظله.....رجلان تحابا في الله اجتمعا عليه وتفرقاعليه"۔

ابوداؤد شریف کی ایک حدیث میں اللہ واسطے محبت کو سب سے بہترین اور افضل ترین عمل بتایا گیا ہے:"اَفْضَلُ الأعْمَالِ اَلْحُبُّ فِي

اللّٰہِ، وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ" ایک حدیث میں ایسے شخص کو جنت کی خوشخبری سنائی گئی ہے:"من عاد مریضاً أو زار أخاً له فی اللّٰه ناداه مناد أن طبت و طاب ممشاك و تبوات من الجنة منزلاً" جو شخص کسی بیمار کی عیادت یا اپنے کسی دینی بھائی کی زیارت اللہ واسطے کرے تو ایک فرشتہ منادی کرتا ہے کہ تم بھی مبارک اور تمہارا چلنا بھی مبارک اور تم نے جنت میں ٹھکانا بنالیا۔

علامہ اقبالؒ جیسے مفکر شاعر نے محبت کو ''فاتح عالم'' کہا ہے، ہر چیز ٹوٹنے اور شکستہ ہونے کے بعد اپنی قیمت واہمیت کو دیتی ہے لیکن دل جتنا ٹوٹتا اور شکستہ ہوتا ہے، اس کی قدر و قیمت اور محبوبیت ومقبولیت بڑھ جاتی ہے، محبت الٰہی سے لبریز قلب ٹوٹ کر اللہ کے نزدیک اپنا مقام حاصل کر لیتا ہے، اس لئے حدیث شریف میں ہے "أنا عندمنكسرة قلوبهم" میں شکستہ خاطر اور ٹوٹے ہوئے دل والوں کے پاس ہوں۔

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے، تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

انسان کے دل میں جو محبت، نرمی، رقت وگداز اور درد ہے، اس دیگر مخلوقات حتی کہ فرشتے بھی محروم ہیں، اس کی آنکھوں میں محبت کی جو چمک ہے، اسے پیش کرنے سے وہ قاصر ہیں، آج دنیا میں سارے خلفشار، انتشار کی وجہ جہاں حب مال وجاہ ہے اور تمام تر فرقہ وارانہ فساد کی جڑ اور مذہبی منافرت کا سبب یہی اقتدار ودولت کی حرص وہوس ہے، وہیں پر ایک اہم وجہ دلوں میں محبت والفت کی کمی اور جسمانی قربت کے باوجود اندرونی فاصلے ہیں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ پیام انسانیت کے ایک جلسہ سے خطاب فرماتے ہوئے اور اپنا درد دل بیان کرتے ہوئے انسانیت کو جو پیغام خصوصاً ہندوستان جیسے ملک وماحول میں دیتے ہیں، وہ بڑا بصیرت افروز اور چشم کشا ہے، اس خطاب کی ایک جھلک پیش خدمت اور سپرد قرطاس ہے: ''انسان کے پاس جو سب سے بڑا سرمایہ ہے وہ رحم کا سرمایہ ہے، وہ محبت کا سرمایہ ہے، وہ ایک آنسو ہے جو انسان کی آنکھ سے کسی بیوہ کے سر کو ننگا، کسی غریب کے چولہے کو ٹھنڈا، کسی مریض کی کراہ کو سن کر ٹپک پڑتا ہے، آنسو کا وہ قطرہ جو سمندر میں ڈال دیا جائے تو اسے پاک کر دے، گناہوں کے جنگل میں ڈال دیا جائے تو سب کو جلا کر نور سے بدل دے، فرشتے سب کچھ پیش کر سکتے ہیں لیکن آنسو کا وہ قطرہ نہیں پیش کر سکتے، جس کی قیمت آپ نے بھی نہیں پہچانی.....

انسان کے پاس سب سے انمول چیز یہ ہے کہ وہ دوسرے کے درد سے متاثر ہوتا ہے، اس کے اندر محبت کا مادہ ہے.....انسان، انسان کا دل دیکھتا ہے، اس کے درد کو محسوس کرتا ہے، جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے اور وہ کھینچنے پر مجبور ہے، اسی طرح انسان کے دل کا مقناطیس انسان کے دل کو کھینچتا ہے۔

اگر انسان سے یہ دولت چھن جائے تو وہ دیوالیہ ہو جائے گا، اگر کوئی ملک اس سے محروم ہو جائے، اگر امریکہ کی دولت، روس کا نظام، عرب ممالک کے پٹرول کے چشمے ہوں، بن برستا ہو، سونے اور چاندی کی گنگا جمنا بہتی ہو، لیکن اس ملک میں محبت کا چشمہ خشک ہو چکا ہو، تو وہ ملک کنگال ہے، اس ملک پر اللہ کی رحمتیں نازل نہ ہوں گی۔

ابھی انسان کی آنکھ آنسو بہانے کے قابل ہے، ابھی انسان کا دل تڑپنے، سلگنے اور چوٹ کھانے کے قابل ہے، جو دل اس قابل نہیں ہے، ایسے دل کو دل نہیں کہتے بلکہ پتھر کی سل کہتے ہیں.....وہ آنکھ انسان کی آنکھ نہیں نرگس کی آنکھ ہے، جس میں نمی نہ ہو، وہ دل انسان کا دل نہیں، چیتے کا دل ہے جس پر کبھی درد کی چوٹ نہ لگے، علامہ اقبال نے اسی وجہ سے محبت کو ''فاتح عالم'' قرار دیا ہے:

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

یہی محبت ہے جو آزاد کو اسیر وغلام بنا دیتی ہے، اور اس کی وہ سے انسان دلوں پر فتح حاصل کر کے ان پر حکمرانی کرتا ہے، اولیاء اللہ اور اہل دل حضرات کا یہی معاملہ تھا، آج ضرورت اسی کی ہے:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہی مردوں کی شمشیریں

کردار و عمل

اصلاح معاشرہ میں خواتین کا کردار

مولانا محمد عمر قاسمی مجاہد پوری

اللہ تعالی نے اپنے آخری رسول حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو دائمی اور ابدی تعلیمات نازل فرمائی ہیں ان سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالی کی ٹھیک ٹھیک بنائی ہوئی ساخت کے مطابق انسانی زندگی کا نظام درست کیا جائے، اس کے لئے عورتوں کی اصلاح اتنی ہی ضروری ہے جتنی مردوں کی، اسلام جس اللہ کی عبادت کی طرف بلاتا ہے وہ عورتوں کا بھی ویسا ہی خدا ہے جیسا مردوں کا ہے، جس دین کو وہ حق کہتا ہے وہ عورتوں کے لئے بھی ویسا ہی حق ہے، جیسے مردوں کے لئے ہے، جس جہنم سے اسلام بچانا چاہتا ہے وہ عورتوں کے لئے اتنی ہی خوفناک ہے جتنی مردوں کے لئے ہے، اور جس جنت کی امید دلاتا ہے وہ عورتوں کے لئے اتنی ہی کوشش سے مل سکتی ہے، جس طرح مردوں کو اپنی کوشش سے۔

اگر کسی مرد کی نجات کے لئے یہ بات کافی نہیں ہوسکتی کہ اس کی بیوی یا ماں بہن ایمان لائی تھی اور اللہ کی خوشنودی کے لئے کوشش کرتی رہتی تھی تو ظاہر ہے کہ کوئی عورت بھی اس بنا پر نجات نہیں پاسکتی کہ اس کا شوہر یا باپ یا بھائی ایمان لایا تھا، اللہ تعالی کے یہاں کوئی شخص بھی کچھ نہیں پاسکتا جب تک اس نے خود کچھ پانیکی کوشش نہ کی ہو۔

اس لئے اسلام کا تقاضہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کو یکساں اپنی اپنی نجات کی فکر ہو، ہر ایک دل وجان سے وہ خدمات بجالائے جو اسے اللہ تعالی کی سزا سے بچائیں اور اس کے انعام کا مستحق بنائیں۔

تحریک اصلاح معاشرہ کی جو تاریخ ہمارے سامنے ہے وہ ہمیں بتاتی ہے کہ ابتداء سے عورتوں نے اس تحریک میں مردوں کے ساتھ برابر حصہ لیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی سعادت سب سے پہلے جس ہستی کو نصیب ہوئی وہ ایک خاتون ہی تھیں یعنی ہماری اور آپ کی اور سب مسلمانوں کی ماں حضرت خدیجۃ الکبری ہی تھیں جنہوں نے بار نبوت کو اٹھاتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کانپتے ہوئے دل کو تسکین دے رہی تھیں، جو دس سال تک ہر قسم کی سختیوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین رفیق بنی رہیں، اور اصلاح معاشرہ میں خاتون اول کی حیثیت سے شاندار کردار ادا کیا اور انہی کا مال ودولت اور سرمایہ تھا جس سے مکی دور میں اصلاح معاشرہ کا مشن جاری وساری رہا۔

اصلاح معاشرہ کی اس تحریک میں نبوت کے پہلے تین سالوں میں جو ۵۵/اشخاص ایمان کے ساتھ شامل ہوئے ان میں ۹/عورتیں شامل تھیں، پانچ چھ برس تک مکہ مکرمہ میں اصلاح معاشرہ کی خاطر انتہائی ظلم وستم سہنے کے بعد جو ۶۳/اشخاص اپنے گھر بار چھوڑ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے ان میں ۱۸/عورتیں شامل تھیں، جنہوں نے دین وایمان کی خاطر جلاوطنی کی مصیبتوں میں اپنے شوہروں اور بھائیوں کا ساتھ دیا مکہ مکرمہ میں جن لوگوں نے کفار کے ہاتھوں سب سے بڑھ کر ظلم سہے ان میں اگر بلال اور عمار رضی اللہ عنہم جیسے مرد تھے تو ام عمیس، ام عمارہ اور زنیرہ رضی اللہ عنہن جیسی عورتیں بھی تھیں، اسی طرح مدینہ منورہ میں جہاں انصار کے مردوں نے اصلاح معاشرہ اور اسلام کی خاطر قربانیاں دیں، عورتوں نے بھی کم حصہ نہیں لیا، ایک نیک بخت شہیدوں کے ماں کا قصہ روایات میں آیا ہے کہ جس نے جنگ احد کے موقع پر اپنے بیٹوں کو بلایا اور ایک ایک کو رخصت کیا اور کہا کہ بیٹا پیٹھ نہ دکھانا، میں نے اس دن کے لئے تم کو دودھ پلایا تھا، اس کے بعد ایک

ایک کی شہادت کی خبر سنتی رہی اور جب اپنے آخری بیٹے کی شہادت کی خبر سنی تو ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے "الحمدللہ الذی اکرمنی بشھادتھم" اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے ان کی شہادت سے مجھے سرفراز فرمایا اور اس کی عزت بخشی۔

اسی جنگ میں ان کے شوہر باپ اور بھائی کی شہادت کی خبر پہنچی تو اس نے پوچھا مجھے یہ بتاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو خیریت سے ہیں، اور جب اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بخیریت دیکھ لیا تو کہنے لگی آپ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو ہر مصیبت قابل برداشت ہے۔

اسی جنگ احد میں ایک خاتون ام عمارہؓ پانی پلانے کی خدمت کر رہی تھیں، جب انہوں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوگئے ہیں اور کفار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نرغہ کرلیا ہے تو تلوار کھینچ کر سامنے آ کھڑی ہوئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانے کے لئے لڑتی رہیں یہاں تک کہ شانے پر گہرا زخم کھایا۔

یہ اور ایسے ہی بے شمار واقعات بتاتے ہیں کہ اسلام کی راہ میں جو کچھ مردوں نے کیا ہے اس سے کم عورتوں نے نہیں کیا ہے، انہوں نے اس دین کی خاطر ظلم بھی سہے، خطرات بھی مول لئے، جان و مال کی قربانیاں بھی دیں، عزیز و اقارب کو بھی چھوڑا، جلاوطنی اور فقر و فاقہ کی تکلیفیں بھی اٹھائیں، اور اپنے ایمان دار باپوں، شوہروں اور بھائیوں کے ساتھ وفاداری کا حق بھی پوری طرح ادا کیا یہ ان خواتین کے کارنامے ہیں جن کی بدولت ابتداء میں اسلام دنیا پر چھایا تھا، رسالت کے عہد کی خواتین کا واسطہ کفار اور بدترین دشمن اسلام سے تھا اس کے باوجود جو کچھ انہوں نے اپنے دین اور معاشرہ کی اصلاح کے لئے کردار ادا کیا تھا اور جس جرأت و ہمت و استقلال کے ساتھ اپنے خاندان کی انتہائی مخالفت اور دشمنی کے مقابلہ میں حق پرستی کا کمال دکھایا وہ ہمیشہ تمام دنیا کی عورتوں کے لئے ایک بہترین نمونہ رہے گا۔

سب سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو لیجئے ان کا حقیقی بھائی ان کا چچا زاد بھائی اسود اور اسود کا بیٹا زمعہ یہ لوگ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں ابوجہل کے دست راست تھے، لیکن اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور پشت پناہی کرتی رہیں اور خود اپنے میکے والوں کی دشمنی کی انہوں نے ذرہ برابر پرواہ نہیں کی۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو دیکھئے ان کے ایک چچا کا بیٹا ابوجہل تھا، دوسرا چچا ولید بن مغیرہ تھا، اور اس کا بیٹا خالد اسلام کا سخت دشمن تھا، ان کا اپنا حقیقی بھائی عبداللہ ہر وقت اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی میں سرگرم تھا مگر اس کے باوجود یہ بہادر خاتون اسلام لائیں اور جب خاندان والوں نے بہت زیادہ تنگ کیا تو گھر بار خاندان چھوڑ کر حبشہ کی طرف ہجرت کرگئیں۔

حضرت عمر کی بہن فاطمہ کی مثال لیجئے ان کا باپ خطاب اور ان کا ماموں ابوجہل دونوں اسلام دشمنی اور مسلمانوں پر ظلم کرنے میں کسی سے کم نہ تھے، باپ بھائی اور ماموں کے اس رویہ سے وہ واقف تھیں پھر بھی اپنے شوہر کے ساتھ اسلام قبول کرنے سے نہ جھجکیں، عمر کو جب معلوم ہوا کہ بہن اور بہنوئی دونوں ایک اصلاحی تحریک میں داخل ہوکر مسلمان ہوگئے ہیں، تو وہ ٹوہ لگانے آئے، ابھی دروازے پر ہی تھے کہ اندر سے قرآن کریم پڑھنے کی آواز آئی، گھر میں گھس کر بہن اور بہنوئی دونوں کو خوب مارا یہاں تک کہ لہولہان ہوگئے، مگر اس اللہ کی بندی نے بھائی سے صاف کہہ دیا کہ عمر تم چاہے مار ڈالو یہ حق جو میں پا چکی ہوں اسے چھوڑ نہیں سکتی، اس پر بھائی کا دل پسیجا، اور اس نے کہا کہ ذرا میں بھی تو سنوں کہ وہ کیا چیز تھی جو تم دونوں پڑھ رہے تھے، بہن نے قرآن کریم کے اوراق نکال کر سامنے رکھ دئے جن میں سورہ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی، بھائی نے پڑھنا شروع کیا اور جوں جوں پڑھتا گیا حق کی تاثیر دل میں اترتی چلی گئی، یہاں تک کہ جب سورت ختم ہوئی تو وہی دل جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تک کفر اور بغض اسلام سے بھرا ہوا تھا، ایمان سے لبریز ہوگیا۔

اسی طرح ایک عورت ہی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ عمر فاروق جیسے عظیم الشان کو اسلام کے دائرے میں لائی جس کا نام تاریخ اسلام میں ہمیشہ ہمیشہ درخشاں رہے گا۔

یہ ہیں سچے اور مسلمان عورتوں کے کارنامے اگر موجودہ دور کی خواتین کو اپنی نجات درکار ہے تو یہی کردار ان کو بھی اپنے اندر پیدا کرنا ہوگا، شریعت نے ریاست کے دفاع اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری عورتوں پر نہیں ڈالی لیکن اس کے باوجود خدا تعالی کے دین کو سربلند دیکھنے کی تمنا ان کو دشمن کے خلاف محاذ جنگ پر لے آئی اور مردوں کے ساتھ وہ بھی کفر کا جھنڈا سرنگوں کرنے میں حصہ لیتی تھیں۔

اسماء بنت یزید کے ہاتھ سے جنگ یرموک میں نو رومیوں کو موت کا پیالہ پینا پڑا، ایک انصاری خاتون ام حارث کی ثابت قدمی اور شجاعت دیکھئے کہ جنگ حنین میں اسلامی فوج کے قدم میدان سے اکھڑ چکے ہیں لیکن چند باہمت نفوس کے ساتھ پہاڑ کی طرح جمی ہوئی ہیں۔

دشمنان اسلام دین کو ناکام بنانے میں عورت نے جتنا براہ راست حصہ لیا ہے اس سے کہیں زیادہ بالواسطہ باطل قوتوں کا مقابلہ کرتی رہیں، اگر اس نے محاذ جنگ پر تیر نہیں چلائے تو دشمن پر حملہ کرنے والوں کو تیر فراہم کئے ہیں، اگر اس نے تلوار نہیں اٹھائی ہے تو تیغ زنوں کو تیغ زنی کے قابل بنایا ہے، خدا کی راہ میں لڑنے والے زخمی ہوتے، تو یہ ان کا مرہم بن جاتی، وہ گر پڑتے تو یہ ان کا سہارا ہوتی، وہ بھوکے اور پیاسے ہوتے تو یہ ان کے لئے کھانا اور پانی لئے دوڑتی۔

دین کی مدافعت اور اس کی ترغیب:

دین کی مدافعت خواتین جس طرح شمشیر وسنان کے ذریعہ کرتی رہی ہیں، اسی طرح زبان وبیان سے بھی انہوں نے یہ فریضہ انجام دیا ہے، حق کی نصرت وحمایت میں نیزہ اور تلوار بھی بلند کیا ہے، اور زبان کی قوت بھی صرف کی ہے، ان کی پرجوش خطابت وتقریر سے بہت سوں کے لئے اللہ کی راہ میں مرنا اور جینا اور اپنی ہر متاع حیات کا لٹانا آسان بنادیا، حضرت عبداللہ بن زبیر کو سولی دینے کے بعد حجاج ان کی والدہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پاس گیا اور کہا کہ آپ کے صاحبزادے نے خدا کے گھر میں بے دینی اور الحاد پھیلایا جس کی سزا خدا نے اس کو دردناک عذاب کی شکل میں چکھائی ہے، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا تم نے جھوٹ کہا وہ بے دین نہیں تھا، وہ تو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنیوالا، روزے دار اور تہجد گزار تھا، حقیقتاً تم نے اس پر زیادتی اور ظلم کیا ہے، قسم خدا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا تھا کہ قبیلہ ثقیف سے دو جھوٹے پیدا ہوں گے، ان میں بھی دوسرا پہلے سے بدتر ہوگا، کیونکہ وہ ہلاکت وتباہی مچائے گا، ثقیف کے پہلے جھوٹے مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کو تو دیکھ چکے اور دوسرے تم ہو، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو لکھا کہ مجھے ایک مختصر سی نصیحت لکھ کر بھیج دیجئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انتہائی مؤثر اور ایک حاکم وقت کو رہنمائی کا کام دینے والا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد لکھ کر بھیجا ''جو شخص لوگوں کو ناخوش کر کے اللہ تعالی کی رضا حاصل کرے، اللہ تعالی اس کو انسانوں کے شر سے بچالیتا ہے؛ لیکن جو شخص اللہ کو خفا کر کے لوگوں کی رضا ڈھونڈے تو اللہ تعالی اس کو انہی کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ جس طرح چاہتے ہیں اس پر حکومت کرتے ہیں''۔

یہ واقعات اس بات کی قطعی ثبوت ہیں کہ اسلامی معاشرے نے مسلمان عورتوں پر بہت سی سیاسی، سماجی ذمہ داری عائد کیں ہیں اور مسلمان عورتوں نے اپنے خانگی فرائض کے ساتھ ان سے بھی عہدہ برآ ہونے کی سعی کی۔ ❁❁❁❁

حضرت مولانا کبیر الدین فاران مظاہری مدظلہ العالی
ناظم مدرسہ قادریہ مسروالا ہماچل پردیش کی تین تازہ ترین تصنیفات
(۱) مٹی کا چراغ جلد اول صفحات ۴۳۶/ قیمت ۳۰۰/روپئے
(۲) دعوت وتبلیغ انسانیت کی اصلاح کی کلید صفحات ۳۲۔
قیمت ۲۵/روپئے
(۳) استاد (زمین سے عرش تک پہنچانیوالی ذات، صفات اور حقائق کے آئینہ میں) صفحات ۴۰۔ قیمت ۳۰/روپئے
ملنے کا پتہ
مکتبہ عزیزیہ مدرسہ قادریہ مسروالا، ہماچل پردیش
Website. madrasaquadria.org
Email. quadriahp@gmail.com

تبصرے

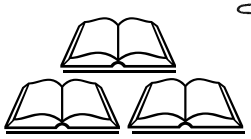

نئی کتابوں پر تبصرہ

محمد مسعود عزیزی ندوی

نام کتاب: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی زندگی
نام مصنف: مولانا حفظ الرحمٰن پالن پوری
صفحات: ۴۶۴/ قیمت: درج نہیں
ناشر: ادارۃ الصدیق ڈابھیل، گجرات

پیش نظر کتاب ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی زندگی'' حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قاسمی پالن پوری شیخ الحدیث ادارہ دینیات ممبئی کی ایک شاہکار کتاب ہے، جس میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، کتاب کا اہم ہونا تو موضوع سے ہی معلوم ہوتا ہے، مگر موصوف نے جس عرق ریزی محنت اور جانفشانی سے جنبش قلم کی ہے، اور سادہ اور سہل اسلوب میں سیرت نبوی کے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے وہ بہت ہی خوبصورت اور البیلے انداز میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی زندگی کو اڑتیس ابواب میں سمیٹنے کی ایک اچھی کوشش ہے، جو دینی مدارس کے طلبہ اور اسکول وکالجز اور یونیورسٹی کے اسٹوڈینٹ کے لئے خاصے کی چیز ہے، بلکہ اجتماعی مجالس میں پڑھ کر سنانے اور عملی زندگی میں نکھار پیدا کرنے کے لئے ایک بہترین انسائیکلوپیڈیا ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ صرف عوام ہی نہیں بلکہ علماء کرام کو بھی ہر وقت اپنے پاس رکھنی چاہئے، راقم یہ سمجھتا ہے کہ مؤلف محترم کی جنتی بھی قلمی کاوشیں ہیں اور وہ تقریباً ۱۷ ہیں ان تمام میں سب سے اہم اور ضروری ہے پیش نظر کتاب ہے۔

جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا توکل واعتماد علی اللہ، حکمت وسیاست، شجاعت وبہادری، عفت وپاکدامنی، عدل وانصاف، صدق وسچائی، جود وسخاوت، ایثار وہمدردی، صبر وتحمل، شکر وعزم واستقلال، استقامت ومداومت، شرم وحیا، توبہ وانابت الی اللہ، ایفائے عہد، زہد وقناعت حلم وبردباری، ورع وتقوی، عفوودرگزر، امانت ودیانت، گریہ وبکا اور رقت قلبی، اعتدال ومیانہ روی، تواضع وانکساری، نرمی وخوش خلقی، حسن معاملہ، مساوات، ہدیہ لینا، مشورہ، حسن معاشرت، صلہ رحمی، ضیافت، مہمان نوازی، عبادت، تعزیت، سلام وتحیہ، مصافحہ ومعانقہ، مزاح وخوش طبعی، رحمت وشفقت جیسے اخلاق فاضلہ وحمیدہ، خوبصورت لڑی کی طرح ایک جگہ جمع کردئے گئے ہیں، پھر ہر حدیث کی تخریج کردی گئی ہے، جس سے کتاب کی وقعت واہمیت بہت بڑھ گئی ہے، شروع کتاب میں حضرت مولانا قمر الزماں صاحب الہ آبادی کی تقریظ اور حضرت مفتی احمد صاحب کانپوری کے دعائیہ کلمات ثبت ہیں، اللہ تعالی قبول فرمائے، مؤلف محترم کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور قارئین کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرکے پڑھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

نام کتاب: فیضان گنگوہی
نام مصنف: مولانا ڈاکٹر حکیم محمد ادریس حبان رحیمی
صفحات: ۴۲۴/ قیمت: درج نہیں
ناشر: رحیمی کتب خانہ گنگونڈ ہلی، نزد چندرائے آرٹ، بنگلور

پیش نظر کتاب ''فیضان گنگوہی'' حضرت مولانا محمد مصطفیٰ کامل رشیدی اعرابی نبیرہ حضرت گنگوہی وخلیفہ مجاز حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کے حالات زندگی وسوانح حیات اور خانقاہ قدوسیہ رشیدیہ کے تذکرہ پر مشتمل ہے، جس کو حضرت موصوف کے متوسل بزرگ عالم دین وحکیم حاذق حضرت مولانا محمد ادریس حبان صاحب رحیمی چرتھاولی مقیم حال بنگلور نے بڑی عرق ریزی، محنت وجانفشانی سے حضرت مولانا مصطفیٰ صاحب کی وفات کے ۳۵/سال بعد مرتب فرمایا اور حضرت کے متوسلین ومتعلقین اور گنگوہ سے نسبت رکھنے والے قارئین پر احسان عظیم فرمایا، کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، مؤلف محترم نے حضرت مولانا مصطفیٰ صاحب کا اچھا سراپا کھینچنے کی بہت اچھی کوشش کی ہے، جس سے موصوف کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے، وہیں صاحب تصنیف مولانا حکیم صاحب کے ذوق عالی اور طبعی نفاست اور قلمی مہارت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، کہ انہوں نے کس خوبصورتی سے اپنے عالی مقام بزرگ کے حالات قلمزد کئے ہیں، مؤلف موصوف صاحب علم بھی ہیں اور صاحب ذوق بھی اور جسمانی حکیم وڈاکٹر ہونے کے ساتھ روحانی طبیب اور عارف بھی، اور وہ اپنے مطب کے ذریعہ سے بھی خدمت خلق کررہے ہیں، اور اپنی خانقاہ کے ذریعہ روحانی مریضوں کی شفایابی کی کوشش بھی، اور نئی نسل کی تعلیم وتربیت کے لئے مدرسہ واسکول بھی چلا رہے ہیں، کتاب کے شروع میں حضرت مولانا مصطفیٰ صاحب کے خلیفہ حضرت صوفی سید اطہر شاہ صاحب سہارنپوری کے تأثرات بھی کتاب کی زینت ہیں، اس کے بعد مولانا مفتی محمد ساجد صاحب قاسمی کے ''حسن افکار'' بھی بہت خوب ہیں، جس میں کتاب کا بھی تعارف ہے اور صاحب کتاب بھی سراپا، اللہ تعالی مؤلف محترم کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور قارئین کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔